U53931.   1[illegible]-12-97

Title - WALI GUJRATI

Creator - Sayyed Zaheer Uddin Madani.

Publisher - (Bombay) Anjuman Islam Urdu Research Institute

Date - 1950

Pages - 156.

Subjects - Wali Gujrati - Sawanch-e-Tanqeed; Tazkira Shora - Wali Gujrati.

سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نمبر ۱

ولی گجراتی

سید ظہیر الدین مدنی

ملنے کا پتہ

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲ ہارنبی روڈ بمبئی ۱

سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نمبر (۱)

مرتبہ
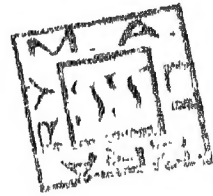
ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ایم، اے، پی، ایچ، ڈی
اسسٹنٹ ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

۱۹۵۰ء

قیمت عہ ر (ہندوستانی و پاکستانی سکہ)

فہرست مضامین

دیباچہ

اردو زبان کے سب سے پہلے بڑے شاعر ولی کی شخصیت کے بعض پہلو ایسے ہیں جن پر محققین مختلف رائیں رکھتے ہیں لیکن یہ اختلافات ولی کے حق میں مفید ثابت ہوئے اور انہی اختلافات نے اہل علم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس کی زندگی سے متعلق ہر قسم کے واقعات جاننے اور اس کے گوناگون کمالات کی تلاش و جستجو میں حتی الامکان کوشش کریں چنانچہ ولی کے نام اس کے سن ولادت و وفات، وطنیت، مذہب و ملت، علمی قابلیت، اس کے رنگ تغزل اور شاعرانہ فن کاری پر کئی اہل علم نے اپنی تحقیق و کاوش کے نتائج سے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

بزم ولی کے شرکت کرنے والوں میں مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب پیش پیش ہیں جنھوں نے ولی کا سنہ وفات تحقیق کرکے کئی غلط فہمیوں کا خاتمہ کر دیا مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کی طرف سے کلیات ولی مرتبہ مولانا احسن مارہروی مرحوم شائع کرکے ولی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ضیافت طبع کا سامان بہم پہونچایا۔ احسن مرحوم نے بھی کلیات کے مرتب کرنے میں بڑی محنت و کاوش سے کام لیا اور ایک مقدمہ بھی لکھا جو کئی حیثیتوں سے بہت مفید ہے اس میں ولی کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ولی کے وطن پر بھی مفصل بحث کی گئی اور لسانی پہلو کے پیش نظر ولی کو دکنی قرار دیا گیا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ کلیات ولی کا پہلا اڈیشن نایاب ہے مولوی عبدالحق صاحب نے اسے دوبارہ شائع کیا۔ طبع دوم کے لائق مرتب جناب نورالحسن صاحب ہاشمی نے بہت ہی جامع طریقہ پر ولی کے رنگ تغزل، شاعرانہ کمال پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس میں جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کا 'ولی کی زبان' پر ایک

عالمانہ تبصرہ بھی شامل ہے جس میں دہلوی زبان کا دکن پر اثر دکھایا ہے اور ولی کی زبان اور دہلوی زبان میں مشابہت و مماثلت کو واضح کیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب پہلے محقق ہیں جنھوں نے بمبئی اور احمد آباد کے کتب خانوں کی مدد سے ولی کا صحیح سنہ وفات دریافت کیا ہے۔ ولی کے سلسلہ میں اہل دکن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے ولی کو روشناس کرانے اور اس سے متعلق قریب قریب تمام پہلوؤں پر معلومات بہم پہنچا کر ولی سے اپنی عقیدت مندی کا ثبوت دیا ہے۔ ان اہل علم میں سے جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری کا نام سرفہرست ہے۔ موصوف ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ تھا کہ ۱۹۳۷ء میں اہل دکن نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ولی کی دو صد سالہ برسی منائی اور ولی کی شاعری پر مقالے لکھوا کر شائع کئے۔ اس جشن کی یادگار مکتبہ کا ولی نمبر ہے۔ اس سلسلہ میں دکن کا دوسرا قابل قدر کارنامہ ادارۂ ادبیات کے سلسلۂ مطبوعات کی ایک کڑی "نذر ولی" ہے۔ یہ جامعہ عثمانیہ کی جماعت ایم۔ اے کی چار طالبات کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان مقالات میں ولی کے تخئیل، اس کے فن شاعری، اس کی معلومات اور متصوفانہ کلام پر شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے۔ گجرات میں تقدم کا سہرا علام محمد منظور شاگرد میاں محمد[ط] کے سر ہے جنھوں نے ۱۲۹۰ھ میں ولی کا دیوان مرتب کرکے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس سلسلہ جناب پروفیسر حید رابراہیم صاحب سایانی نے بھی ۱۹۲۱ء میں ولی کا دیوان دہلی سے شائع کیا۔ موجودہ مصنفین میں مکرم دوست جناب حسینی پیر صاحب نے رسالہ شہاب[ط] میں ولی کے خاندان اور وطن پر اپنی معلومات پیش کرکے تلاش و جستجو کے لئے کافی مواد بہم پہونچایا۔ دوسرے فاضل بزرگ جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی ہیں جنھوں نے ولی کی وطنیت پر محققانہ مقالہ رسالہ معارف علی گڈھ[ط] میں شائع کرکے ایک طرف اپنے علم و فضل اور تلاش و تحقیق سے اہل ذوق کو مستفید ہونے کا موقع دیا اور دوسری جانب وطنیت کی بحث میں اہل گجرات کی نمایندگی کا حق

ط مطبع حیدری بمبئی ط ۱۹۳۴ء ط بابت اکتوبر ۱۹۴۵ء

ادا کیا۔ یہاں جناب یحییٰ تنہا صاحب غازی آبادی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ موصوف نے ولی کے سنہ وفات[1] پر کافی بحث کی ہے اور اپنے بیان کی تصدیق میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔

چوں کہ آج تک ولی کے خاندانی حالات پردۂ اخفا میں تھے اور اس لئے غزل کے اس باوا آدم کے اجتہاد اور دوسرے پہلوؤں کے متعلق محققین سخت مغالطہ میں مبتلا رہے اور انھوں نے اس کی وطنیت کا قصر عالی زبان کی بنیاد پر تعمیر کیا۔ بعض اہل قلم نے لسانی پہلو کے پیش نظر ولی کو دکھنی اورنگ آبادی خیال کیا اور اس کے مرتبۂ زبان و کلام کو سفر دہلی اور شاہ گلشن سے ملاقات کا فیضان سمجھا۔ اگر ولی کی زبان کو بنظر تعمق دیکھا جائے تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کسی ایک علاقہ سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ گجرات، دکن اور شمالی ہند سب اس کی قلمرو میں شامل ہیں اور یہی لسانی وحدت ولی کی جدت بیان کا کرشمہ ہے۔ لیکن گجرات کے بعض اہل علم کے طفیل اب ہمیں ولی کے خاندان، حسب نسب، دوست احباب، عزیز و اقربا سے پوری واقفیت ہو چکی ہے اور ان امور کے ذریعہ اس کے گجراتی و دکھنی ہونے کا پیچیدہ مسئلہ بہت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔

بعض محققین نے ولی کو نرا شاعر ہی سمجھا اور اسی لئے اس کی استعداد علمی کے بارے میں کوئی جچی تلی رائے پیش نہ کر سکے۔ اگر ولی کے کلام کا بامعان نظر مطالعہ کیا جائے تو اس کی علمی قابلیت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے لیکن چونکہ اس کے یہاں قدیم اردو کی وجہ سے زبان اور گرامر کے قواعد کی سختی کے ساتھ پابندی نہیں پائی جاتی بلکہ بہت حد تک آزادی و اجتہاد سے کام لیا ہے بعض اہل علم کو ولی کی علمی استعداد کے متعلق شک ہونے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ نورالمعرفت کی اشاعت کے بعد اب اس قسم کے شک و شبہ کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی اور بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ ولی صرف شاعر ہی نہ تھا بلکہ ایک جید عالم اور انشا پرداز بھی تھا۔ کتب متداولہ پر اسے پورا عبور حاصل تھا اور علوم عقلی و نقلی سے وہ پوری طرح واقف تھا۔ ولی قرآن و تفسیر، تصوف

---

[1] رسالہ زمانہ اپریل ۱۹۳۴ء

و فلسفہ، معانی و بیان کی اصطلاحوں کو جس طریقہ پر اپنے کلام میں لاتا ہے اور انھیں اصطلاحوں کو رسالۂ نور المعرفت میں زور انشا پردازی کے خیال سے استعمال کرتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ولی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔

ولی اپنے زمانہ میں ایک مصلحِ زبان کی حیثیت سے آیا تھا وہ شاعر ہونے کے علاوہ ادب کا نبض شناس بھی تھا اس نے اپنے زمانے کی زبان میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ فارسی اور ہندی کے امتزاج سے ریختہ کے مناسب ایک زبان کو رواج دیا اگرچہ ولی سے قبل بھی فارسی ادب سے کام لیا گیا تھا۔ مگر وہ ناکافی تھا۔ ولی نے فارسی کے سرمایۂ شعر و سخن سے جو فائدہ اٹھایا۔ اس میں ایک خاص توازن پایا جاتا ہے۔ ولی نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ فارسی کے بے شمار محاورے اردو میں ترجمہ کر کے کچھ اس طرح کھپا دئے کہ یہ اردو کے اپنے ہو گئے اس اقدام سے اردو زبان کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس کے الفاظ کے خزانہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہو گیا غرض ولی نے زبان میں تازگی و توانائی پیدا کرنے کے لئے اسے بہترین آلہ بنایا۔

ولی نے ہندوستانی عنصر کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس کے کلام کو بغور دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی کرشمہ آفرین طبیعت نے ایک بڑا خوبصورت امتزاج پیدا کر دیا ہے۔ کلام میں جہاں ایرانی تیر و نشتر پائے جاتے ہیں وہاں ارجن کے بان بھی چل رہے ہیں دجلہ و فرات کے مقابلہ میں نربدا اور تاپتی کو بھی بہایا ہے بلبل ہزار داستان کی نغمہ سنجیوں کے سامنے کوئل کی کوک بھی سنائی دیتی ہے۔ رام اور لچھمن، کاشی اور ہردوار وید اور برہمن اس کے کلام کی صنعت گری کو زینت بخشتے ہیں غرض اس کا کلام فارسی کی وجہ سے شام اودھ ہے تو ہندوستانی عنصر کی وجہ سے صبح بنارس ہے۔ اگر کچھ مدت اور ریختہ کی پرورش اور پرداخت جنوبی ہند تک محدود رہتی تو ممکن تھا کہ ہندوستانی عنصر کا رنگ اردو نظم پر بہت گہرا چڑھ جاتا

اور شمالی ہند میں پہنچنے کے بعد یہ عنصر فارسی کے ساتھ برابر کا شریک ہوتا۔

اگرچہ شاہان دکن کے کلیات اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ولی سے پہلے بھی صنفِ غزل میں کافی داد سخن دی گئی تھی مگر اس کے باوجود یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ولی کے یہاں اردو غزل ایک ایسے بلند مقام پر پہنچی جو فارسی نظم و نثر کے اساتذہ کے لئے بھی قابل رشک ثابت ہوئی۔ ولی سے قبل ریختہ گو کسی قسم کی رومانیت اور تاثیر پیدا نہ کر سکے ان کے مقابلہ میں ولی کے یہاں دوسرا عالم ہے۔ خیالات کی فراوانی، حسن و عشق کی نیرنگیاں، فلسفۂ حیات کے نکات، تصوف کی آمیزش، انداز بیان، پاکیزہ زبان اور فن کارانہ صنعت گری نے مل کر اردو غزل کے قالب میں روح پھونک دی۔ غزل میں ولی کا یہ اجتہاد اس کی امتیازی شان ہے اور غزل گو کی حیثیت سے یہ اس کی شاعرانہ عظمت کا ذمہ دار ہے۔ جب اس خضر سخن نے آبِ حیات کو غزل کی صورت میں پیش کیا تو ہر طرف سے اس کی رہنمائی کا غلغلہ اٹھا اور شمالی ہند کے معجز بیان اساتذۂ فن نے اس کی رہنمائی کی محض داد ہی نہ دی بلکہ اس کی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر بھی سمجھا۔

غزل کے ظاہری و معنوی محاسن کی روشنی میں ولی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو نقشہائے رنگ رنگ نظر آتے ہیں۔ ولی کو ایک باکمال شاعر بنانے میں اس کے ماحول کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ناصر علی سرہندی نے مضمون آفرینی اور استعارات و تشبیہات کی جدت سے دھوم مچا رکھی تھی۔ الفاظ کی تراش خراش اور ترکیبوں کی ندرت بھی اس زمانہ کی ایک خصوصیت تھی۔ ولی کا کلام اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ان سے بہت متاثر تھا۔ ولی کا طویل بحروں میں غزلیں کہنا بھی اس اثر کا غماز ہے ولی کے یہاں جانی پہچانی تشبیہوں اور پرانے استعاروں کی کمی نہیں لیکن یہ اس کے شاعرانہ کمال کی بدولت کہنگی و فرسودگی کے الزام سے بری ہیں اسی طرح ولی کے یہاں صنائع لفظی

و معنوی کی کمی نہیں اس کا کلیات ان سے بھرا پڑا ہے لیکن ان کی تکرار سے وہ بدمزگی پیدا ہونے نہیں دیتا۔ ایہام، مراعات النظیر، تضاد، حسن تعلیل، رد العجز علی الصدر، تجنیس، تنسیق الصفات تلمیح کی بے شمار مثالیں اس کے اشعار میں ملتی ہیں۔ خصوصاً صنعت ایہام کو بہت ہی سلیقہ مندی سے کام میں لیا ہے۔

ہمارا ولی ان صوفی شعرا کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے جنہیں تصوف وراثتہً اور صحبتہً ملا تھا۔ ولی ایک صوفی خاندان کا چشم و چراغ تھا یہ جب سن شعور کو پہنچا تو اپنے ارد گرد صوفیوں ہی کو پایا۔ اس کے کان اہل اللہ کے نعروں سے بچپن ہی سے آشنا ہو چکے تھے ولی کا وہ زمانہ ہے جب احمد آباد میں مشائخ کا سکہ چلتا تھا۔ تمام سلسلوں کے خدا رسیدہ شیوخ موجود تھے علامہ شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ کا مدرسہ اور علوم کے دوسرے سرچشمے تشنگان علوم کو سیراب کر رہے تھے۔ ایسے ماحول اور ایسی صحبتوں کی وجہ سے ولی کے خمیر میں جو صلاحیت تھی اسے ترقی پانے کا موقع مل گیا اور مولانا شیخ نور الدین صدیقی سہروردی قدس سرہٗ کی توجہ خاص نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا۔ اتفاق سے ولی نے زمانہ بھی سیاسی شورشوں اور انقلابوں کا پایا۔ مرہٹوں نے گجرات پر پے در پے حملے کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ گجرات کا امن رخصت ہو چکا تھا۔ دکن میں بیجاپور اور گولکنڈا برسوں کی کشمکش کے بعد اورنگ زیب کے ممالک محروسہ میں شامل ہو چکے تھے۔ ادھر اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں اودھر تخت و تاج کے لئے تلواریں میان سے نکل آئیں۔ دوسری طرف خانہ جنگیوں کو دیکھ کر مرہٹوں نے پھر سر اٹھایا۔ غرض ولی نے یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ ایک زمانہ ہوتا ہے جب لوگ قہر الٰہی سے مذہب میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور ایسے وقت میں دانا و بینا مذہب کا ہی پرچار کرتے ہیں ولی کے دل پر بھی دنیا کی بے ثباتی اور جاہ و حشمت کی بے وقعتی نے ضرور اثر کیا ہوگا۔ ولی کو

خدا نے شعر گوئی کا فن بھی عطا کیا تھا اس نے اس عطیۂ الٰہی سے پورا فائدہ اٹھایا اور کہیں کہیں مجاز کے رنگ میں حقیقت کو پیش کیا۔

جب ہم ولی کے کلام کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کرتے ہیں تو بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ ہر ورقے دفتر یست معرفت کردگار مگر ایسا کہنا ولی سے انصاف نہ ہوگا۔ ولی کے کلام کا بیشتر حصہ تو یقینی اسی دنیا کے عشق و ہوس سے تعلق رکھتا ہے۔ کلام میں کچھ حصہ صوفیانہ رنگ میں پایا جاتا ہے۔ چوں کہ فلسفہ و اخلاق تصوف سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس نوع کے بھی اشعار ملتے ہیں۔ غرض ولی صوفیوں کے ماحول میں پرورش پایا تھا اور خود صوفی منش تھا اس لئے اس نے اس رنگ میں جو کچھ کہا ہے وہ بے جان اور رسمی نہیں ہے۔ اس کے جذبات مستعار نہیں معلوم ہوتے۔ ان میں عارفانہ سرمستی اور آزاد منشی جلوہ گر ہے۔

اگرچہ ولی غزل گو شاعر تھا لیکن اس نے تمام مروّجہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس نے کوئی طویل مثنوی نہیں کہی اس کے باوجود اس کی مثنویوں میں روانی و سلاست پائی جاتی ہے اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ولی مثنوی پر زیادہ توجہ مبذول کرتا تو بہت کامیاب مثنوی گو شاعر ہوتا اور اپنی پختگی اور کہنہ مشقی کا بہترین ثبوت دیتا۔ ولی نے کسی بادشاہ یا امیر کی شان میں قصیدۂ مدحیہ نہیں کہا مگر اس صنف میں اس نے اپنی جودت طبع کے لئے حمد و نعت اور پیران طریقت کی ثنا و صفت کو اختیار کیا ہے۔ اس کے قصائد سے اس کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے اور اگر ولی اس طرف متوجہ ہوتا تو ممکن تھا کہ سودا سے قبل ولی کو قصائد کا بادشاہ سمجھا جاتا۔ اس کے دو تین قصیدے عرفی کے تتبع میں لکھے گئے ہیں اور ایک قصیدہ میں تو وہ عرفی کے ایک مشہور مصرع کی تضمین بھی کرتا ہے کہ

این قصیدہ بیاضی بود نہ دلیوانی

موجودہ تصنیف میں ہم نے ولی کے بعض خاص پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے اب تک ولی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اہل قلم نے جو عرق ریزی کی ہے ان میں ولی کے سوانح حیات ولی کی وطنیت اس کی، استعداد علمی و فارسی دانی اور اس کے کلام میں ہندوستانی عنصر اہم موضوع ہیں۔ ان پہلوؤں کا ولی کی شاعری سے بہت گہرا تعلق ہے اور انھیں غیر معمولی لیاقتوں نے ولی کو ایک مجتہد، بے مثل شاعر اور امام غزل بنایا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر ولی ان گوناگوں خوبیوں کا مالک نہ ہوتا تو اس کے کلام کی کیا حیثیت اور کیا وقعت ہوتی لیکن بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اگر ولی علوم و فنون اور زبان کے نشیب و فراز سے کماحقہ واقف نہ ہوتا تو قدرتی شاعر ہونے کی وجہ سے ایک طومار نویس تو ہوتا مگر نہ تو یہ لسانی وحدت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرتا نہ اس کے کلام میں تازگی وجدت لطیف ذوق سلیم اور شاعرانہ سلیقہ مندی کا نمونہ ہوتا۔

چونکہ ولی کی شاعری اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بعض اہل قلم نے داد تحقیق دی ہے سردست ان پہلوؤں کو ہم نے اس کتاب میں شامل نہیں کیا ہے۔ انشاءاللہ آئندہ کسی وقت اگر حالات نے مساعدت کی تو بقیہ پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

کتاب کے مختلف مضامین میں سے ولی کی علمی استعداد، اور فارسی کے مرغوب شعراء وہ مضامین ہیں جو رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۴۷ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ بقیہ مضامین اب تک شرمندۂ اشاعت نہیں ہوئے تھے۔

یہاں اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اغراض و مقاصد اور لائحۂ عمل کا مختصر طور پر ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ زیر نظر کتاب اسی لائحۂ عمل کو عملی جامہ پہنانے کی پہلی کوشش ہے۔

۱۹۴۷ء میں اس کے قیام کے بعد سے انسٹی ٹیوٹ اپنی منزل مقصود کی طرف تیزی سے

بڑھ رہا ہے۔ اس کے لائحۂ عمل کے پیشِ نظر ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء کیا گیا جسے اہلِ علم اور اربابِ ذوق نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ نوائے ادب کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ گجرات کے متعلق قدیم اردو کے کارنامے جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آئے ہیں انھیں مضامین کے ذریعہ روشناس کرایا جائے۔ نوائے ادب میں مثنویوں کا سلسلہ اسی مقصد سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ گجرات کے قدیم ادب سے دل چسپی رکھنے والے حضرات بھی اس طرف متوجہ ہوئے ہیں اور مثنویوں پر مضامین سپردِ قلم کر رہے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کا سب سے اہم کام تلاش و تحقیق ہے اگرچہ چند اسباب کی وجہ سے اس کی رفتار بہت دھیمی ہے تاہم اسے نظر انداز نہیں کیا گیا۔

سلسلۂ تصنیف و تالیف انسٹی ٹیوٹ کے لائحۂ عمل کا ایک اہم جزو ہے۔ حالات ناسازگار ہونے کے باوجود اب یہ طے کیا گیا ہے کہ ہر سال کم از کم ایک کتاب شائع کی جائے۔ موجودہ کتاب "ولی گجراتی" (ولی کی زندگی کے بعض پہلو) اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اُمید ہے کہ تلاش و تحقیق سے دل چسپی رکھنے والے حضرات اور اہلِ ذوق ہماری اس سعی کوشش کو بنظرِ استحسان ملاحظہ فرمائیں گے۔

انسٹی ٹیوٹ اپنی تمام کارگزاری کے لئے جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی جنرل سکریٹری انجمنِ اسلام بمبئی کا مرہونِ منت ہے۔ صاحبِ موصوف نے انسٹی ٹیوٹ کے معاملات میں جس دل چسپی کا اظہار کیا ہے اور کارپردازوں کی جس طرح حوصلہ افزائی فرمائی ہے اس کے لئے ہم ان کے تہہ دل سے شکرگذار ہیں۔ یہاں صوبۂ بمبئی کی حکومت کے اربابِ حل و عقد کی کشادہ دلی اور بے تعصبی کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا۔ حکومت بمبئی کی طرف سے ہر سال انسٹی ٹیوٹ کو ایک گراں قدر رقم بطور گرانٹ کے ملتی ہے۔

آخر میں پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی اور جناب محمد ابراہیم صاحب ڈار کا بہت شکر گذار ہوں کہ ان دونوں حضرات نے ناچیز کو اپنے علم و فضل سے استفادہ کرنے کا کافی موقع دیا۔ جناب فضل اللہ صاحب فاروقی، ناظم کتب خانہ اور احمد ملک طاسے ایم۔اے کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے کتابت اور طباعت کی منزلوں میں راقم کی کافی امداد کی ہے۔

سید ظہیر الدین مدنی

بمبئی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۵۰ء

ولی کا زمانہ

خاکدانِ ہندوستان پر مسلمانوں نے سات سو سال اپنی حکومت کا پرچم لہرایا۔ اس دور میں اکبر جیسے کشورستاں اور شاہجہاں جیسے ہردلعزیز پادشاہ گذرے مگر اس دور میں اورنگ زیب کا عہد ہر حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے۔ سلطنت تیموریہ اسی دور میں معراج کمال کو پہنچی اور اسی کے بعد سے خاندان مغلیہ کے بدر حکومت میں کاہیدگی شروع ہوگئی۔ سلطنت مغلیہ کا استحکام و عروج، رعب و جلال تمکین و وقار اور عظمت و حشمت اورنگ زیب کے تدبر، سیاست دانی اور انصاف پسندی کا نتیجہ تھا لیکن زوال حکومت کے جراثیم بھی اسی فرمانروا کے عہد حکومت میں پرورش پائے جو اورنگ زیب کے عزم و حزم کے سامنے پوری طرح اپنا زہر پھیلا نہ سکے مگر اس شہنشاہ والاتبار کی آنکھیں بند ہوتے ہی ایسی تحریکیں رونما ہوئیں اور ایسے شگوفے پھوٹے کہ جن پر قابو پانا کسی کے بس کی بات نہ تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کے بعد خاندان تیموریہ میں کوئی ایسا صاحب عقل و فراست اور صاحب سیف و قلم پیدا بھی نہ ہوا جو اتنی وسیع سلطنت اور مختلف مذاہب و اقوام کے ملک پر اپنی رائے و تدبیر یا سنان و شمشیر سے اپنا اقتدار قائم رکھ سکتا۔ اس عروج و استحکام کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اورنگ زیب وہ خوش قسمت بادشاہ تھا جس نے اتنی طویل عمر پائی کہ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہوا۔

آیئے اس کے پنجاہ سالہ دور پر ذرا غائر نظر ڈالیں۔

۱۶۵۷ء کی ۸ ستمبر کو شاہجہاں بیمار پڑا۔ علالت کی خبر کا پھیلنا تھا کہ حقدار تیموری شہزادوں نے ریشہ دوانیاں شروع کردیں۔ دارا شکوہ شاہجہاں کے حضور میں تھا چوں کہ شاہجہان دارا شکوہ پر اپنی مہربانیوں اور شفقت پدرانہ کی بارش برسا رہا تھا اس لئے اس نے دارا کو اجازت دے رکھی

تھی کہ وہ دارالخلافہ میں رہ کر نائبوں کے ذریعہ سے اپنے علاقوں میں حکومت کے کام انجام دے۔ اس کے برعکس شاہ شجاع کو بنگالہ کی صوبہ داری تفویض کی گئی تھی، مراد کو گجرات کا صوبہ دار بنا دیا تھا اور اورنگ زیب کو دکن کے دور دیس میں مصروف کار رکھا۔ شجاع نے باپ کی بیماری کی خبر سنتے ہی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور کثیر فوج کے ساتھ آگرہ کی طرف بڑھنا شروع کیا، شاہجہاں کی طبیعت ایک ہی ہفتہ میں سنبھل گئی اور وہ اطبّا کے مشورہ سے دہلی کی گرم آب و ہوا میں سے آگرہ چلا آیا تھا۔ اگرچہ شاہجہاں نے آگرہ میں دربار منعقد کیا تاکہ رعایا کو یہ پتہ چل جائے کہ بادشاہ زندہ ہے تمام شہزادوں کو بھی واپس لوٹ جانے کے لئے خطوط لکھے لیکن سب کچھ بے سود ثابت ہوا۔ آخر دارا نے اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کو بائیس ہزار کی فوج دے کر شجاع کے مقابلہ میں روانہ کیا۔ اس وقت تک شجاع پٹنہ اور الہ آباد ہوتا ہوا بنارس تک پہنچ چکا تھا۔ بنارس کے قریب بہادر پور ۱۶۵۸ء فروری میں شجاع اور سلیمان شکوہ صف آرا ہوئے۔ شجاع نے اس جنگ میں زک اٹھائی اور بنگالہ کا رخ کیا۔ سلیمان شکوہ نے شجاع کا تعاقب کیا۔

دکن میں اورنگ زیب اور گجرات میں مراد بھی خاموش نہیں بیٹھے، ۱۶۵۷ء نومبر میں مراد نے گجرات کے صدر مقام احمد آباد میں بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اسی سال دسمبر میں دربار منعقد کر کے خیر خواہوں اور افسروں کو مناصب و خطابات عطا کئے۔ چوں کہ تخت و تاج حاصل کرنے تک زر کثیر کی ضرورت تھی احمد آباد کے نگر سیٹھ شانتی داس سے مراد نے پانچ لاکھ پچاس ہزار روپیہ قرض لیا اور اپنے خاندان کے تمام افراد کو قلعہ چانپا نیر میں چھوڑتا ہوا سورت کی طرف بڑھا۔ سورت کے قلعہ پر قبضہ کر کے اس شہر سے قریب سات لاکھ روپیہ فراہم کیا۔ مراد نے اسی اثنا میں شاہ ایران سے بھی سازباز شروع کی اور اس کام کو انجام دینے کے لئے تقرب خاں کو ایران روانہ کیا۔

اورنگ زیب نے اب تک اس بارے میں کوئی اقدام نہ کیا۔ دارا کو اگر کسی کا خوف

تھا تو وہ اورنگ زیب کا کھٹکا دار ابنے اورنگ زیب کو نہتّا کرنے کے خیال سے دکن سے بڑے بڑے افسروں کو دہلی چلے آنے کا حکم دیا۔ مہابت خاں چھترسال وغیرہ تو اورنگ زیب کو بلا اطلاع دئے دکن سے دارالخلافہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ جب کہ بیجاپور کی مہم میں اورنگ زیب الجھا ہوا تھا۔ ان حالات میں بھی اورنگ زیب نے ظاہراطور پر شاہجہاں کو شکایت کا موقع نہیں دیا مگر اپنی تیاری میں کبھی کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اورنگ زیب نے ایک طرف میر جملہ کو اپنا طرفدار بنا لیا اور دوسری طرف مراد سے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا۔ اور دونوں بھائیوں میں ملک کی تقسیم کے لئے عہد و پیمان بھی ہوگئے مراد بخش گجرات سے اوجین کی طرف بڑھا اور دکن سے اورنگ زیب نے طبل کوچ بجایا۔ ۱۶۵۸ء کے ماہ اپریل میں اورنگ زیب اور اُدھر سے مراد بخش دیپال پور پہنچے دونوں شہزادوں نے یک جہتی و یگانگت کا اظہار کیا عہد و پیمان بالمشافہ طے ہوئے اور دیپال پور سے دونوں اوجین کی طرف بڑھے۔

شاہجہاں نے آگرہ سے راجہ جسونت سنگھ اور دوسرے اعلیٰ افسروں کی کمان میں ایک فوج اجین روانہ کی۔ راجہ کو شاہجہاں نے یہ ہدایت کی تھی کہ جنگ وجدال سے قبل شہزادوں کو اتمامِ حجّت کے طور پر ہر طرح صورت حال سمجھائی جائے۔ اگر شہزادے واپس لوٹ جائیں تو بہتر ورنہ بہ صورت دیگر شمشیر کے زور سے اقدام کو روکا جائے۔ راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں اجین کے قریب پہلے ہی سے مقام دھرمات تجویز کر چکے تھے۔ جب اورنگ زیب اور مراد کی فوجوں کی آمد کا غلغلہ سنا تو راجہ کو فکر لاحق ہوئی۔ اور اورنگ زیب جیسے کار دیدہ کے مقابلہ میں پہلے پس و پیش کرنے لگا لیکن چارو ناچار اسے صف آرا ہونا پڑا۔ عاقل خاں کا بیان ہے کہ اورنگ زیب نے راجہ کو پیغام بھیجا کہ شہزادگان کا مقصد جہاں پناہ کی عیادت کے لئے آستانہ پر حاضری دینا ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ وہ جنگ کا ارادہ ترک کر دے لیکن راجہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ چونکہ وہ اسی امر خاص کے لئے بھیجا گیا ہے اور اس کا واپس جانا جہاں پناہ کی خوشنودی کا باعث نہ ہوگا

اگر آنحضرت (اورنگ زیب) دکن کی طرف مراجعت کریں تو وہ واپس لوٹ جائے اور اگر آنحضرت اس بات پر راضی نہیں تو گستاخی کے لئے معذور ہوں۔

بالآخر دوسرے روز صبح دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں اور نقارۂ جنگ گونجنے لگا میدان کارزار گرم ہوا۔ نصف النہار تک راجپوت بڑی جانبازی سے لڑے مگر اس وقت تک شاہی فوج کے کئی مسلمان اور راجپوت سردار کام آچکے تھے۔ راجہ جسونت سنگھ نے جب ہاتھ سے بازی جاتے دیکھی تو خلاف رسم جوانمردی میدان کارزار چھوڑ دیا اور شرمندگی کی وجہ سے آگرہ جانے کے بجائے مالوہ چلا گیا۔ شاہی فوج نے بھی میدان سے بھاگنا شروع کر دیا اور تھوڑی دیر میں اورنگ زیب کی فوج میں فتح و نصرت کا غلغلہ بلند ہوا۔

شاہجہاں اس دوران میں دہلی جارہا تھا راستہ ہی میں اسے شکست کی خبر ملی۔ دارا کے اصرار پر شاہجہاں آگرہ کو لوٹ گیا۔ اگرچہ شاہجہاں اس خونریزی کو کسی طرح روکنے کے خیال سے خود اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ میدان جنگ میں جانا چاہتا تھا اس صورت میں شاہجہاں کو یقین تھا کہ شہزادے اس کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دیں گے مگر دارا کی کوتاہ اندیشی کی وجہ سے شاہجہاں اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا نہ سکا۔ شاہجہاں دارا کے ہاتھ میں گویا قید تھا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ دارا نے اس خیال سے کہ وہ اورنگ زیب کو بہ آسانی شکست دے دیگا فوراً کوچ کے لئے تیاری کا حکم دیا۔ دارا نے قلعہ سے چلتے ہوئے فاتحہ خیر پڑھا اور قدم بوسی بجا لایا۔ شاہجہاں قلعہ پر سے بڑی دیر تک اپنے چہیتے بیٹے کی روانگی پر فوج کے جاہ و حشم کا نظارہ کرتا رہا۔ دارا ۱۶۵۸ء کی ۱۸ مئی کو ایک لاکھ فوج کے ساتھ دھول پور کی طرف روانہ ہوا دھول پور پہنچ کر اس مقام کے زمینداروں کی مدد سے دریائے چنبل کے راستوں اور گھاٹیوں پر توپیں نصب کرادیں تاکہ تمام راہیں مسدود ہو جائیں اور اورنگ زیب دریائے چنبل عبور نہ کرسکے لیکن اورنگ زیب دارا سے بہت زیادہ دوربین اور تجربہ کار تھا

اس نے ایک غیر معلوم راستہ سے فوج کے ساتھ دریا عبور کر کے سموگڈھ میں مقام کیا۔ اس اثناء میں جہاں آرا نے خط کے ذریعہ اورنگ زیب کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی مگر اورنگ زیب اس سے متاثر نہ ہوا اور خط کا نہایت معقول جواب لکھ بھیجا ۱۶۵۸ء کی ۲۹ مئی کو صبح مخالف فوجیں میدان میں صف آرا ہوئیں۔ دارا نے بہت زوروں سے اورنگ زیب کے لشکر پر حملہ کیا۔ اورنگ زیب چونکہ نبرد آزما تھا مدافعانہ لڑتا رہا۔ راجپوت سرداروں نے باری باری سے مراد اور اورنگ زیب کے ہاتھیوں پر مردانہ وار حملے کئے مگر ان میں سے ایک بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا اور ہر ایک نے اپنی جان سے ہاتھ دھویا۔ جب اورنگ زیب نے دارا کی فوج کی بے ترتیبی دیکھی تو جارحانہ حملہ کر دیا۔ میدان میں دارا کا ہاتھی قابو سے باہر ہو گیا دارا نے فوراً ہاتھی چھوڑ دیا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دارا نے میدان میں یہ اجتہادی غلطی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے ہی سپاہیوں نے دارا کے ہاتھی کا ہودہ خالی پایا تو سمجھے کہ دارا کا کام آچکا ہے۔ سپاہی بددل ہوئے اور میدان چھوڑنا شروع کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود دارا کو بھی میدان چھوڑنا پڑا۔ دارا رات ہی رات آگرہ پہنچا اور اپنی حویلی میں تھوڑی دیر توقف کیا۔ شاہجہاں کو اس شکست اور دارا کی آمد کی اطلاع پہنچی تو اس نے دارا کو طلب کیا مگر دارا نے حاضری سے پہلوتہی کی اور اسی رات پچھلے پہر دہلی روانہ ہو گیا۔

اورنگ زیب اس فتح کے بعد دوسرے ہی روز آگرہ پہنچا اور شہر کے قریب اپنی مظفر و منصور فوج کے ساتھ باغ نور محل میں قیام کیا۔ چوں کہ بخت و فیروزی اورنگ زیب کے آستانہ پہ ناصیہ فرسا تھے شاہی ملازمین و مقربین اس ابو المظفر کے در دولت پر تحفہ مبارک باد لے کر پہنچے اور انعام و منصب سے سرفراز ہوتے۔ شاہجہاں نے اورنگ زیب کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری کیا۔ اسی موقع پہ شاہجہاں نے تحفتہً ایک شمشیر بھیجی تھی جس پر عالمگیر کندہ تھا۔ اورنگ زیب باپ کی قدمبوسی کے لئے جانے کا ارادہ کر چکا تھا لیکن چند معتبر ذرائع سے اسے معلوم ہو گیا کہ شاہجہاں کی نیت میں فتور ہے اس لئے اورنگ زیب نے ارادہ

بدل دیا اور قلعہ کے محاصرہ میں سختی کردی اور رسد پر بھی پہرے لگا دیئے۔ جب شاہجہاں نے ہر طرح اپنے آپ کو عاجز و مجبور پایا تو بادل ناخواستہ قلعہ کی چابیاں اورنگ زیب کے حوالے کر دیں۔ اورنگ زیب نے قلعہ کا قبضہ لیا شاہجہاں کو قید کیا اور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

شاہجہاں دارا کی محبت میں اس قدر دیوانہ تھا کہ بہ حالت قید و بند بھی اس نے پنجاب کے صوبیدار مہابت خاں کو لکھ بھیجا کہ وہ دارا کی اعانت و استعانت میں کمی نہ کرے۔ ادھر اورنگ زیب کے بیٹے محمد سلطان کو بہکانا شروع کیا کہ وہ اپنے چچا شجاع سے سازباز کر کے اورنگ زیب کا کام تمام کر دے مگر شاہجہاں اپنی ان کوششوں میں کامیاب نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ آخری زمانہ میں اورنگ زیب کی طرف سے شاہجہاں کا دل صاف ہو گیا تھا اور شاہجہاں کی وفات یعنی ۱۶۶۶ء تک آپس میں تعلقات خوش گوار رہے۔

سموگڈھ کی جنگ میں ظفریابی اور سیاست دانی نے اورنگ زیب کے اثر و اقتدار کو دہ چند کر دیا تھا۔ یہ بات مراد کو کھٹکنے لگی ادھر حاشیہ نشینوں نے اورنگ زیب کے خلاف مراد کے کان بھرنا شروع کیا کہ اورنگ زیب کا قصد دہلی مصلحت سے خالی نہیں وہاں پہنچ کر یہ اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا چاہتا ہے اور حقیقت کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ اورنگ زیب نے اسے آگرہ میں کچھ دن آرام و استراحت میں بسر کرنے کا مشورہ دیا تھا چوں کہ مراد جنگ سموگڈھ میں بہت زخمی ہو گیا تھا۔ مراد سادہ لوح تھا، باتوں میں آ گیا اور اورنگ زیب کے پیچھے پیچھے اپنے لشکر کے ساتھ منزلیں طے کرتا رہا۔

مراد کی حرکات و سکنات دیکھ کر اورنگ زیب کو اس کے بہی خواہوں نے یہ مشورہ دیا کہ ابھی زیادہ اہم کارگذاری درپیش ہے اور مراد بخش کی حرکتیں باعث تردد ہیں اس لئے شہزادے کو قید کر دیا جائے۔ اورنگ زیب نے مراد کو صلاح و مشورہ اور شوق ملاقات کے بہانہ سے بلایا۔ مراد بھی فوراً جانے کیلئے آمادہ ہو گیا لیکن اس کے ہوا خواہوں نے یہ کہہ کر جانے سے باز رکھا کہ اورنگ زیب کی نیت خراب ہے۔ اس وقت مشیروں کے اصرار پر مراد نہیں گیا مگر ایک روز اورنگ زیب کا

نور الدین نامی ایک خادم مراد کے خیمہ میں پہنچا اور یہ اطلاع دی کہ اورنگ زیب نہایت شدید دردِ شکم میں مبتلا ہے اور وہ اپنے بھائی کے شوقِ ملاقات میں تڑپ رہا ہے۔ مراد اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس خبر کی بلا تصدیق کئے فوراً اورنگ زیب کے خیمہ پہ پہنچا۔ یہاں بڑے تپاک سے مراد کا استقبال کیا گیا اس کے ملازمین کو اندر جانے نہ دیا اور مراد کو اندر لے جایا گیا۔ خود اورنگ زیب تعظیم کو اٹھا کچھ دیر گفتگو ہونے کے بعد مراد کے سامنے شاہی ماحضر پیش کیا گیا اور طے پایا کہ قیلولہ کے بعد مجلس مشورت منعقد کی جائے گی۔ مراد نے کمر سے اپنے سلاح کھول کر الگ رکھ دئے اور بستر استراحت پر دراز ہو گیا اس دوران میں ایک کنیز نے آکر سلاح اٹھا لئے افسر جو اس موقع کے منتظر تھے ارد گرد جمع ہو گئے۔ جب مراد نے آنکھیں کھولیں تو اپنے بخت کو خفتہ پایا۔ مراد نے اپنے آپ کو بے بس دیکھ کر کہا کہ میرے جیسے صاف باطن کے ساتھ یہ سلوک کیا اور وہ عہد و پیمان جو قرآن کریم کو ضامن رکھ کر کئے گئے تھے خوب بجا لائے۔ اورنگ زیب نے جو پس پردہ کھڑا تھا اس کا جواب دیا کہ یہ جو کچھ کیا گیا ہے اس کا مقصد محض اپنے بھائی کے سر سے غرور و نخوت دور کرنا ہے اور ہمارا یہ خیال ہے کہ کچھ دن آپ صبر و سکون سے گذاریں۔ اس کے بعد مراد کو گوالیار کے قلعہ میں پہنچا دیا گیا۔ مراد کی فوج میں جب یہ خبر پہنچی تو لوگ بہت دل برداشتہ ہوئے اور آخر آہستہ آہستہ اورنگ زیب کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

مراد چار سال قید و بند میں رہا۔ ایک روز اس کے بہی خواہوں نے اس کو قید سے چھڑانے کے لئے قلعہ کی فصیل پر سے اترنے کا انتظام کیا۔ مراد قلعہ چھوڑنے سے پہلے اپنی محبوبہ سرسوتی بائی سے (جو اورنگ زیب کی اجازت سے قید خانہ میں مراد کے ساتھ تھی) آخری بار ملنے گیا جب سرسوتی مراد کے ارادہ سے آگاہ ہوئی تو بے اختیار چیخ اٹھی اس کی آواز سے پہرہ دار جاگ اٹھے اور یہ بھاگ نکلنے میں ناکام رہا۔

اورنگ زیب اس خبر سے متفکر ہوا مراد کا کام تمام کرنے کے لئے آخر کار علی نقی خان جس کو گجرات میں مراد نے قتل کر دیا تھا کے بیٹے کو عدالت میں مراد پر اپنے باپ کے خون کے سلسلہ میں مقدمہ دائر کرنے پر راضی کر لیا۔ مقدمہ کا فیصلہ مراد کے خلاف دیا گیا اور اس طرح دسمبر ۱۶۶۱ء میں نامراد مراد کو قتل کر دیا گیا۔

دارا نے اورنگ زیب کے دہلی کی طرف بڑھنے کی اطلاع ملتے ہی دہلی سے لاہور کا رخ کیا۔ لاہور میں دارا کا پرانا نمک خوار غیرت خاں موجود تھا جس نے اس کی کافی مدد کی۔ شاہی خزانہ سے دارا کو ایک کروڑ روپیہ دستیاب ہوا سرہند میں اسے ایک زمیندار افسر کا دفینہ ہاتھ لگنے سے بارہ لاکھ روپیہ مل گیا اب اس نے فوج فراہم کرنا شروع کیا اور تقریباً دس ہزار سپاہی اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے اگرچہ دارا کا خیال تھا کہ اورنگ زیب دو جنگیں لڑ چکا ہے اور اس صورت میں اس کا پنجاب جلد پہنچنا دشوار ہے تاہم دارا نے دریائے ستلج پر پہرے بٹھلا دئے تاکہ اورنگ زیب اسے عبور نہ کر سکے۔ اورنگ زیب دہلی پہنچا اور ۱۶۵۸ء میں بتاریخ ۲۱ جولائی مختصر طور پر رسم تخت نشینی ادا کی گئی اور دربار منعقد کر کے افسران خیر اندیش کو مناصب و انعامات عطا کئے۔ اگست کے وسط میں دارا کے خلاف توقع دریائے ستلج عبور کر لیا۔ دارا ہمت ہار گیا اور فوج کے ساتھ ملتان چلا گیا مگر یہاں بھی اسے عافیت نصیب نہ ہوئی۔ اورنگ زیب نے لاہور میں تین ہفتہ قیام کیا اور نظم و نسق کی دیکھ بھال کی اور دارا کے تعاقب میں مختلف افسروں کی کمان میں فوجیں روانہ کر دیں۔ دارا سندھ کے ریگستان میں تین ماہ بھٹکتا رہا۔ سفر کی صعوبتوں سے گھبرا کر اور کچھ دارا سے مایوس ہو کر اس کے وفا شعار افسروں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس میں دارا کی فوج چودہ ہزار سے سات ہزار اور آخر میں تین ہزار باقی رہ گئی۔ دارا سندھ سے کچھ کی طرف گیا اور کاٹھیاوار ہوتا ہوا گجرات چلا آیا۔

شکست خوردہ دارا صحرا نوردی کر رہا تھا مراد قید ہو چکا تھا، اورنگ زیب آگرہ سے

بہت دور تھا اور قلعہ اکبر آباد ایک ناتجربہ کار شہزادہ محمد سلطان کے قبضہ میں تھا۔ شجاع نے ان حالات کے پیش نظر دوبارہ قسمت آزمائی کا خیال کیا۔ یہ پٹنہ سے کثیر التعداد فوج کی ہمراہی میں آگرہ کی طرف بڑھا۔ اورنگ زیب نے یہ صورت حال دیکھ کر محمد سلطان کو شجاع کے مقابلہ میں بڑھنے کا حکم دیا اور خود بھی منتخب فوج کے ساتھ الہ آباد کی طرف بڑی سرعت کے ساتھ منزلیں طے کرتا ہوا پہنچا۔ اسی اثنا میں دکن سے میر جملہ بھی اپنی فوج کے ساتھ آگیا تھا۔ ادھر شجاع پٹنہ سے الہ آباد کی طرف بڑھا الہ آباد کا قلعہ دارا کے ایما سے اس کے افسروں نے شجاع کے حوالہ کر دیا اسی طرح بنارس چنار وغیرہ جو اب تک دارا کے افسروں کے قبض و تصرف میں تھے شجاع کے لئے معاون و مددگار ثابت ہوئے آخر الامر مقام کھجوا پر دونوں حریف فوجوں نے قیام کیا۔ اس مقام پر اورنگ زیب نے اپنی فوجوں کو ترتیب دیا۔ دو روز کی جنگ و جدال کے بعد شجاع نے ہزیمت اٹھائی اور میدان چھوڑ کر بھاگا۔ غرض جنوری ۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب نے اپنے دوسرے بڑے مخالف کو ہمیشہ کے لئے میدان سے نکال دیا۔

شجاع کے تعاقب میں میر جملہ کو بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ شجاع شکست خوردہ تھا لیکن اس کے باوجود اورنگ زیب کے افسروں کو تقریباً ڈیڑھ سال پریشان کرتا رہا تا وقتیکہ شجاع نے ہر ایک راہ اپنے پر مسدود پا کر سنہ ۱۶۶۰ء میں بتاریخ ۱۲ مئی ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا اور مع اہل و عیال کے ساتھ آراکان چلا گیا۔ جہاں اس شہزادہ کے حشر سے مورخ لاعلمی ظاہر کرتے ہیں مگر کہا جاتا ہے کہ شجاع اس مقام کے راجا کو قتل کرنے کی سازش میں پکڑا گیا اور آخر کار قتل کر دیا گیا۔

پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ دارا کچھ سے گجرات چلا گیا۔ احمد آباد میں شاہ نواز خاں نے جو اورنگ زیب کا متعین کردہ صوبہ دار تھا غداری کی اور شاہی خزانہ دارا کے سپرد کر دیا۔ دارا نے گجرات میں ڈیڑھ ماہ قیام کر کے فوج فراہم کی اور اجمیر کی طرف بڑھا ہر چند دارا کے ساتھ کثیر فوج تھی

لیکن اس کے لئے اورنگ زیب جیسے جرنیل اور سیاست داں کے مقابلہ میں لڑنا مشکل تھا اجمیر کی جنگ میں مارچ ۱۶۵۹ء میں شکست فاش کھائی جس کے بعد دارا کو فرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دارا سندھ ہوتا ہوا قندھار جانا چاہتا تھا اورنگ زیب کا لشکر اس کے تعاقب میں تھا۔ اس کے اچھے افسروں نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کیا ادھر سپاہیوں نے بھی دارا کے خیمے لوٹنا شروع کیا۔ دارا نے مقام دادر میں اپنے ایک قدیم پروردہ زمیندار ملک جیون کے یہاں پناہ لی مگر بخت نے یاوری نہ کی۔ اس نمک حرام نے قدیم احسانات کا بھی خیال نہ کیا اور دارا کو گرفتار کر لیا۔ اور راجہ جے سنگھ اور بہادر خاں کے حوالہ کر دیا۔ ۲۳ر اگست ۱۶۵۹ء میں دارا کو دہلی لایا گیا اور ۳۰ر اگست کو یہ بدنصیب شہزادہ قتل کر دیا گیا۔ سلیمان شکوہ الہ آباد سے بہ دقت تمام سرینگر پہنچا یہاں راجہ نے اس سے اچھا سلوک کیا مگر اورنگ زیب نے ہندو افسروں کی مدد سے سلیمان کو حاصل کر لیا۔ سلیمان پہلے تو قید میں رکھا گیا ایک سال کے بعد سلیمان شکوہ مئی ۱۶۶۲ء میں قید اورنگ زیب اور قید حیات دونوں سے آزاد ہو گیا۔

کھجوا اور اجمیر میں فتح و نصرت پانے کے بعد اورنگ زیب نے ۱۶۵۹ء کے وسط میں دوبارہ تقریب تخت نشینی بہت ہی تزک و احتشام کے ساتھ منائی۔ ۱۲ر مئی کو شہر دہلی میں بڑی شان و شوکت سے جلوس نکالا گیا جو قلعہ کے لاہوری دروازہ سے قلعہ میں داخل ہوا۔ دیوان عام و دیوان خاص میں آراستگی کا پورا اہتمام کیا گیا۔ دربار میں اہل دربار اور منجموں کی تجویز کردہ نیک ساعت کے منتظر تھے۔ مسعود ساعت آپہنچی اورنگ زیب پردہ کے پیچھے سے نکل کر تخت پہ جلوہ افروز ہوا۔ اہل دربار کے چہروں پر مسرت و انبساط کی لہریں دوڑ گئیں۔ اہل دربار تسلیمات بجالائے اور تبریک تہنیت پیش کی شعرا نے تہنیتی قصیدے پڑھے۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے مناصب و انعامات تقسیم کئے۔ شاہی ملازموں نے گلاب پاشی کی اور پان تقسیم ہوئے۔ دارالضرب میں

فوراً سکہ ضرب کیا گیا۔ بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اور کئی دن تک آتش بازی سے دہلی کی راتیں دن میں تبدیل ہو گئیں۔ غرض اس رسم کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ ادا کیا گیا۔

اس دو سال کی جنگ و جدال سے ملک کو بہت نقصان پہنچا۔ تمام قلمرو میں نظام حکومت درہم برہم ہو گیا تھا۔ شاہی ملازم خود مختاری سے کام لے رہے تھے۔ شہزادوں نے صوبوں کے شاہی خزانے خالی کر دیے تھے۔ لشکروں کی نقل و حرکت نے ملک کی زراعت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ فوجوں نے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کھیتوں میں تیار فصلیں کاٹ لیں جس کی وجہ سے غلّہ کی قلّت ہو گئی اور گرانی کی وجہ سے غریب بھوکوں مرنے لگے ہر طرف چوری ڈاکہ کی کثرت نے بدامنی اور بے چینی پھیلا رکھی تھی تجارت کی منڈیاں سرد پڑی ہوئی تھیں غرض یہ دو سال کا عرصہ اہل ہند کے لئے بڑا آزمائش کا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب تخت نشینی کے بعد سب سے پہلے تنظیم و ترتیب قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوا اور فرامین کے ذریعہ ہر صوبہ میں شاہی ملازموں کے نام احکامات بھیجنا شروع کیا۔ ایسا ایک فرمان ۱۶۶۵ء میں گجرات کے اعلیٰ افسروں کے نام صادر ہوا تھا اس فرمان والا شان میں ۳۶ شقّیں ہیں۔ اس فرمان کی چند شقیں اقتصادی حالات کے پیش نظر محصولات کی معافی سے متعلق ہیں اور اس کا ایک حصہ اخلاقی و مذہبی اصلاحات سے تعلق رکھتا ہے۔ خافی خاں کے بیان کے مطابق قریب اسّی محصول معاف کر دیے گئے تھے۔ اسی طرح فرامین سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب ابتدا سے ملک کی صنعتوں کا بڑا خیال رکھتا اور انھیں ترقی دینے میں حوصلہ افزائی کرتا۔ غرض اورنگ زیب نے بہت قلیل عرصہ میں اپنے اثر و اقتدار سے ملک کا نظم و نسق ایک حد تک درست کر لیا تھا ورنہ ابتدائی دور کی محض شورشیں ہی ایسی سخت تھیں جو حکومت کا تختہ الٹ دیتیں۔

عہد اورنگ زیب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا حصہ شمالی ہند کے واقعات سے تعلق رکھتا ہے جیسے آسام و کوچ بہار کی جنگیں۔ بہار اور اڑیسہ کے زمینداروں کے فسادات

جاٹوں کی شورش، راجپوتوں کی سرکشی سکھوں کے مقابلے اور سرحدی پٹھانوں کی لوٹ مار وغیرہ۔
اس دور کا نصف ثانی دکن سے تعلق رکھتا ہے۔ خود اورنگ زیب نے پچیس سال دکن میں گذارے
گویا شمالی ہند سے پایۂ تخت دکن میں منتقل ہوگیا تھا۔ اگرچہ خود اورنگ زیب دکن میں اس طویل مدت
کے قیام سے نہ اکتا گیا ہو لیکن اہل دربار، فوجی افسر اور شاہی ملازمین کو وطن کی یاد نے بیتاب کر دیا تھا۔
دکن کی مہمیں اورنگ زیب کے عہد کی تمام مہموں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں یہی وہ زمانہ ہے جب کہ
شیواجی نے اپنی قوم کو منظم کیا اور ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

اس دور میں بڑی ہنگاموں کو چھوڑ کر دو قسم کی شورشیں پائی جاتی ہیں چند فسادات محض
مقامی تھے جنھیں مقامی افسروں نے فرو کر دیا۔ دوسری قسم کی شورشیں وہ ہیں جو باج گذار ریاستوں
اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے سرداروں نے برپا کیں جن پر قابو پانے کے لئے شاہی فوجوں کو
متعین کرنا پڑا۔

مقامی بلووں سے حکومت کو کوئی خاص نقصان نہ پہنچا۔ صرف تھوڑی مدت کے لئے
ان مقامات کا نظم و نسق درہم برہم ہو جاتا تھا۔

۱۶۵۹ء میں متھرا کے نواحی علاقہ میں راجپوتوں نے ایک بہادر پنج نامی شخص کی
سرداری میں بلوہ کیا۔ ۱۶۶۰ء میں چکر سین بھیل نے میوات میں فساد برپا کیا، ۱۶۶۳ء میں نیازی
سرحدیوں نے دریائے سندھ عبور کر کے بعض مغل علاقوں میں لوٹ مار کی۔ ۱۶۶۵ء میں
ہمیر سین نے شاہ آباد میں، ۱۶۶۶ء میں جموں کے راجہ نے اور ۱۶۶۹ء میں گونڈ زمیندار بھوپ سنگھ
نے فساد برپا کیا۔

اسی طرح الہ آباد، بہار اور راڑ بیسہ کے زمینداروں نے بغاوت پر کمر باندھی مگر ان تمام
فسادات کو بہت جلد دبا دیا گیا۔

چند باج گذار ریئسوں نے بھی ابتدائی دور کی بدنظمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی بیکانیر کا راؤ کرن شاہجہاں کے عہد حکومت کے آخری سالوں میں دکن کی مہم پر بھیجا گیا تھا مگر اورنگ زیب کے عہد میں اس نے اطاعت سے منہ موڑا۔ اورنگ زیب نے ۱۶۶۰ء میں اس کی تادیب کے لئے نو ہزار کا لشکر بھیجا۔ راؤ تاب مقاومت نہ لایا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ اورنگ زیب نے درخواست قبول کی اور منصب عطا کر کے دکن کی مہم پر روانہ کر دیا ۱۶۵۹ء میں چمپت رائے بندیلے نے خود مختاری کا اعلان کیا۔ اورنگ زیب نے اس کے خلاف راجپوت سرداروں کو بھیجا۔ چمپت رائے مغلوں کے مقابلہ میں شکست کھا کر فرار ہو گیا اور مدت تک صحرانوردی کرتا رہا اور جب بے بس ہو گیا تو خودکشی کر لی لیکن راجہ جے سنگھ کی کوشش سے اس کے بیٹے چھتر سال نے اورنگ زیب کی اطاعت قبول کر لی اسے فوج میں شامل کر کے شیواجی کے خلاف دکن کی مہم پر بھیج دیا گیا۔ دکن میں چھتر سال نے شیواجی سے ساز باز شروع کی اور آخر کار اپنے وطن واپس آیا جہاں ڈاکوؤں کی زندگی بسر کرتا رہا۔

اورنگ زیب کے ابتدائی عہد میں سرحدیوں نے بھی لوٹ کھسوٹ شروع کی۔ لیکن ان کو بہت جلد مطیع کر لیا گیا۔ ۱۶۶۷ء میں ایک یوسف زئی بھگو نامی افغان نے ایک شخص کو محمد شاہ کا لقب دے کر بادشاہ بنایا اور خود وزیر بن بیٹھا اور ضلع ہزارہ اور اٹک کو لوٹا اور ان مقامات پر قبضہ بھی کر لیا مگر بہت جلد ان کے قلع قمع کے لئے مغل فوجیں روانہ کی گئیں۔ جنگ میں یوسف زئی زیادہ دیر ٹھہر نہ سکے۔ اس کے بعد ان طائفوں کے بڑے بڑے سرداروں کو تحفے تحائف اور تنخواہیں دیکر زیر کر لیا گیا۔ اس شورش کے بعد ۱۶۷۲ء تک کوئی خاص واردات پیش نہیں آئی۔ چوں کہ سرحد پر کسی قابل اور تجربہ کار فوجی افسر کی ضرورت تھی اس لئے ۱۶۷۱ء کے وسط میں راجہ جسونت سنگھ کو درۂ خیبر کے قریب مقام جمرود کا

فوجدار بنا کر بھیجا گیا تھا۔

سنہ ۱۶۷۲ء میں جلال آباد کے فوجدار کی حرکتوں سے سرحد کے آفریدی مغلوں کے خلاف ہو گئے اور اکمل خاں نامی ایک آفریدی کی سرداری میں مغلوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ سنہ ۱۶۷۲ء کے موسم بہار میں محمد امین بن میر جملہ جو افغانستان کا صوبہ دار تھا پشاور سے کابل جا رہا تھا۔ راستہ میں اسے اطلاع ملی کہ آفریدیوں نے راستے بند کر دیئے ہیں محمد امین ان اطلاعات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے آگے بڑھا لیکن محمد امین اور اس کے لشکر کو آفریدیوں نے اتنا تنگ کیا کہ آخر اس نے آفریدی سرداروں کے ساتھ صلح کے لئے گفت وشنید شروع کی مگر اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد محمد امین نے آفریدیوں کے خلاف فوج کے دستے بھیجنا شروع کیے مگر اس جنگ میں مغل لشکر نے ہزیمت اٹھائی اور محمد امین اور فوجی اپنی جان بچا کر پشاور واپس آ گئے۔ اس جنگ میں آفریدیوں کے ہاتھ تقریباً دو کروڑ روپیہ لگا اور دس ہزار مغلوں کو غلام بنا کر لے گئے اور ایشیائے وسط میں ان غلاموں کو فروخت کیا محمد امین خاں کو اس جگہ سے بدل کر گجرات بھیج دیا۔ اور گجرات سے مہابت خاں کو افغانستان کی صوبہ داری کیلئے نامزد کیا۔ مہابت خاں سرحدیوں کے خوف سے ہراساں تھا اور کابل جانے میں پس وپیش کر رہا تھا اورنگ زیب نے دہلی سے شجاعت خاں کو لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ مگر شجاعت خاں اور راجہ جسونت سنگھ میں اختلاف رائے ہونے کی وجہ سے اس مہم میں مغلوں کو بڑا نقصان ہوا۔ آخر سنہ ۱۶۷۴ء کے وسط میں اورنگ زیب خود گیا اور ڈیڑھ سال حسن ابدال مقام پر قیام کر کے اپنی سیاست دانی اور فوجی لیاقت سے سرحدیوں کو زیر کیا۔

بنگالہ کا نظم ونسق ۱۶۵۸ء ہی سے درہم برہم ہو گیا تھا۔ شہزادگان کی جنگ کے دوران میں آسام، کوچ بہار اور برما کی سرحد کے لوگوں نے بدنظمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

مغلیہ مملکت کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا تھا اور ڈھاکہ کے قریب تک پہنچ گئے تھے۔ ۱۶۶۱ء جون میں میر جملہ کو بنگالہ کا صوبہ دار مقرر کیا۔ میر جملہ نے جاتے ہی راشد خاں کو آسام کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا اور کوچ بہار پر سجّان رائے کو بھیجا اور بعدہٗ خود میر جملہ کوچ بہار کی طرف بڑھا میر جملہ نے کوچ بہار کی ریاست کو مغلیہ قلمرو میں شامل کر لیا اور اس مقام پر سولہ روز قیام کر کے آسام کی طرف بڑھا۔ آسام مغلوں کے مقابلہ میں کئی مہینے لڑتا رہا۔ میر جملہ کی فوج کو سیلاب گھنے جنگل اور وبا کے پھیلنے کی وجہ سے بڑا نقصان پہنچا لیکن میر جملہ کے ارادوں میں تزلزل پیدا نہ ہونے پایا آخر صلح کے معاہدے پر اس جنگ کا خاتمہ ہوا مگر پوری طور پر آپس کے کھچاؤ اور کدورتوں کا خاتمہ نہ ہوا تھا اس لئے ۱۶۶۷ء سے ۱۶۷۰ء تک دوبارہ مغلوں اور اسامیوں میں جنگ ہوتی رہی۔ بنگال کی آب و ہوا اور جنگ آسام میں تکالیف کی شدت نے میر جملہ کی صحت پر بہت برا اثر کیا اور یہ آسام سے ڈھاکہ جاتے ہوئے راستہ میں انتقال کر گیا۔

میر جملہ کے انتقال کے بعد شائستہ خاں کو بنگالہ بھیجا گیا۔ عرصہ دراز سے چاٹ گاؤں کے فرنگی اور آراکانی بحری ڈاکوؤں نے بنگالہ کی بندرگاہوں میں ادھم مچا رکھی تھی۔ یہ ڈاکو بنگالہ کے شہر دیہات اور بندرگاہیں لوٹتے اور کثیر تعداد میں بنگالیوں کو غلام بنا کر لے جاتے اور بیچتے یا کاشتکاری میں ان سے کام لیتے۔ ڈاکو مال غنیمت میں سے نصف حصہ آراکان کے راجہ کو دیتے اور نصف خود لیتے۔ جب شائستہ خاں نے دیکھا کہ ان ڈاکوؤں کے ظلم و تشدد سے بنگالہ کے دیہات اور شہر ویران ہوتے چلے جاتے ہیں تو اس نے ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ابتدا میں ان سے جنگیں لڑا لیکن فرنگی ڈاکوؤں کو اپنی طرفداری میں لے کر آخر کار چاٹ گاؤں بھی فتح کر لیا اور اس طرح ۱۶۶۶ء میں ان بحری ڈاکوؤں کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔

اورنگ زیب کی مذہبی اصلاحات اور اس بارے میں اس کے طرزِ عمل سے ہندو رعایا ناخوش تھی اور اسی کی آڑ میں اکثر شریر عنصر بغاوت پر کمرباندھتا اور علاقہ کے امن کو برہم

طرح غارت کر دیتا۔ اورنگ زیب کے افسر بھی اپنے بادشاہ کی خوشنودی کے لئے ایسے ہی طریقے اختیار کرتے جو فریق ثانی کی دل شکنی کا باعث ہوتے مثلاً متھرا کے نواح میں ۱۶۶۹ء سے عبد النبی نامی فوجدار متعین تھا۔ اس نے ایک مندر سے ایک کندہ پتھر جو دارا نے بطور تحفہ دیا تھا نکلوا دیا یہ دیکھ کر اس ضلع کے جاٹوں نے گوکل نامی ایک شخص کی سرداری میں فساد برپا کیا اور عبد النبی فوجدار کو قتل کر دیا۔ اورنگ زیب نے فوراً اعلیٰ افسروں کی کمان میں فوج بھیجی اور بہت جلد اس فتنہ کو دبا دیا گیا۔

ایسا ہی دوسرا واقعہ ستنامیوں کی شورش کا ہے جس میں آپس کے جھگڑے کو مذہبی رنگ دے کر تعصب کی آگ کو ہوا دی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۶۷۲ء میں میوات کے علاقہ میں ایک ستنامی فرقہ کے کسان کے کھیت کی خبر گیری ایک مسلمان سپاہی رکھتا تھا۔ کسی بات پر ان دونوں میں نزاع ہوا۔ سپاہی نے اس ستنامی کسان کا سر پھوڑ دیا۔ اس بات پر اس فرقہ کے کچھ لوگوں نے سپاہی کی اتنی زدوکوب کی کہ وہ مرنے کے قریب ہو گیا۔ جب شقدار نے گنہگار کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تو اس بات پر فرقہ کے تمام ستنامیوں نے بلوہ کر دیا۔ اورنگ زیب کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے فساد کو دور کرنے کے لئے فوج بھیجی اور ستنامیوں کے ساتھ بڑی خونریز جنگ ہوئی جس میں قریب دو ہزار ستنامی کام آئے۔

اس دور میں سکھوں نے بھی اپنی قوم کی بڑی تنظیم کی اور ایک مذہبی فرقہ کے بجائے سیاسی فرقہ میں اپنے آپ کو تبدیل کر دیا۔ سکھوں کی تنظیم کو بھی اورنگ زیب کے مذہبی خیالات کا ردعمل بتایا جاتا ہے مگر ان کی تاریخ سے یہ واضح ہے کہ عہد جہانگیر سے اس قوم کے پیشواؤں نے اپنی قوم کی فوجی تنظیم شروع کر دی تھی۔ اس کا بڑا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ جہانگیر نے ۱۶۰۶ء میں گرو ارجن کو اس جرم پر قتل کرا دیا تھا کہ گرو نے شہزادہ خسرو کو شہزادہ کی بغاوت کے زمانہ میں بادشاہ

کے خلاف مددودی تھی اس واقعہ کے بعد سے سکھوں نے اپنے کو گرو ہرگوبند کی پیشوائی میں منظم کرنا شروع کیا۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں سکھ گرو تیغ بہادر نے اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بات اتنی بڑھی کہ تیغ بہادر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے اس واقعہ کے بعد گرو گوبند سنگھ نے اپنی قوم کو جنگجو قوم بنانے کی طرف توجہ مبذول کی۔ اگرچہ عہد اورنگ زیب میں یہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنا نہ سکے مگر ان کے پیشواؤں نے فقر کو چھوڑ کر شاہی طریقۂ معاشرت اختیار کیا۔ قلعے بنوانے لگے اور زمینداروں سے جنگیں کرتے رہتے۔ ایسی بعض سرکشیوں کے خلاف مغل فوجوں کو بھیجا گیا جن کے مقابلہ میں سکھوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ اورنگ زیب نے اپنے آخری زمانہ میں گرو گوبند سنگھ کو اعزاز کے ساتھ دربار میں آنے کی دعوت دی گرو گوبند سنگھ اورنگ زیب کی دعوت پر دکن جانے کے لئے تیار ہوئے لیکن اسی اثنا میں اورنگ زیب کے انتقال کی خبر ملی تو گوبند سنگھ نے دکن جانے کا خیال ترک کر دیا۔

اورنگ زیب کے دور حکومت کے نصف اوّل میں راجپوتوں کی شورش بہت اہمیت رکھتی ہے اس کے آغاز کا سبب یہ ہوا کہ راجہ جسونت سنگھ جو درۂ خیبر میں جمرود کا فوجدار تھا انتقال کر گیا۔ چوں کہ راجہ کی اولاد نرینہ نہیں تھی اورنگ زیب نے ریاست جودھپور کو اپنی قلمرو میں شامل کر لینا چاہا۔ فوراً مسلمان فوج دار، قلعہ دار، امین، کوتوال وغیرہ عہدے داروں کا ریاست میں تقرر کیا۔ اورنگ زیب کو بعد میں معلوم ہوا کہ راجہ جسونت سنگھ کی دو رانیوں کے بطن سے دو بچے پیدا ہوئے جن میں سے ایک مر گیا اور دوسرا اجیت سنگھ زندہ تھا۔ راجپوت سردار بچہ کو دہلی لے گئے اور جودھپور پر اس کا حق ثابت کرنے کی کوشش کی مگر اورنگ زیب نے اجیت سنگھ کو شاہی دربار میں پرورش پانے کے بعد جودھپور اس کے سپرد کرنے کا وعدہ کیا جسونت سنگھ کے ایک نمک خوار درگا داس نے اس بات کو

پسند نہیں کیا اور اجیت سنگھ کو مغلوں کے پنجہ سے بچا کر مارواڑ لے آیا۔ اورنگ زیب نے اس واقعہ کے بعد مارواڑ پر سربلند خاں کی کمان میں ایک فوج بھیجی اور خود بھی اجمیر گیا۔ راجپوتوں نے مغل فوجوں کا مقابلہ کیا لیکن ہزیمت اٹھائی اور اس طرح مارواڑ مغل قلمرو میں شامل کر دیا گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر میوات کے رانا اور دوسرے راجپوت سرداروں نے اجیت سنگھ کے حق کے لئے لڑنے کا تہیہ کر لیا۔ اورنگ زیب نے میوات کو فتح کرنے کے لئے تجربہ کار افسروں کو روانہ کیا اور خود بھی اجمیر سے آگے بڑھا۔ مغلوں نے پہلے تو بہت جلد پورے میوات پر قبضہ کر لیا مگر راجپوت ابھی ہمت نہیں ہارے تھے اور اورنگ زیب کے اجمیر لوٹ آنے کے بعد پیہم حملے کر رہے تھے۔ راجپوت کو دبانے میں مغلوں کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ اس لئے اورنگ زیب نے فوراً شہزادہ اکبر کو میوات سے مارواڑ بھیج دیا اور شہزادہ معظم کو اس کی جگہ متعین کیا۔ مارواڑ میں مقام جھیلواڑہ پر راجپوتوں سے ایک جنگ ہوئی جس میں شاہی لشکر فتح مند رہا مگر اسی کے بعد اکبر راجپوتوں سے مل گیا اور ۱۶۸۱ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور فوج لے کر اجمیر کی طرف بڑھا۔ اس موقع پر اورنگ زیب نے اپنے سیاسی تدبر سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجپوت اکبر کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اکبر کو بھی اس صورت میں واپس راجپوتانہ جانا پڑا۔ میوات کا رانا ہمت ہار گیا اور مغلوں سے صلح کر لی مگر مارواڑ میں درگاداس اس کے بعد تیس سال تک اجیت سنگھ کے حق کے لئے لڑتا رہا۔ اکبر درگاداس کے ساتھ تھا مگر جب راجپوتوں نے دیکھا کہ اکبر کا مارواڑ میں رہنا دشوار ہے تو اسے دکن شمبھوجی کے پاس پہنچا دیا۔ آخر بہادر شاہ نے اپنے عہد حکومت میں جودھ پور پر اجیت سنگھ کے حق کو مان لیا۔

دکن:۔ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے پچیس سال دکن کے میدان جنگ میں گذارے اور آخر اسی جگہ اس دور کا خاتمہ بھی ہوا۔ اورنگ زیب کو دکن میں تین حریفوں کا

مقابلہ کرنا پڑا۔ یہی وہ دور ہے جب کہ شیواجی نے مرہٹہ قوم کی صرف تنظیم ہی نہیں کی بلکہ ایک مرہٹہ حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ دکن کی مسلم سلطنتیں کافی کمزور ہوچکی تھیں تاہم اورنگ زیب کو انھیں مسخر کرنے میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔

۱۶۵۸ء سے ۱۶۸۲ء یعنی اورنگ زیب کے راجپوتانہ کی مہم سے فارغ ہوکر دکن آنے تک دکن کے پانچ صوبہ دار گذرے جن میں شہزادہ شاہ عالم گیارہ سال، بہادر خاں چھ سال، شائستہ خاں چار سال، جے سنگھ دو سال دلیر خاں ایک سال صوبہ دار کے عہدہ پر فائز رہے ان صوبہ داروں کے زمانہ میں دکن میں میدان کارزار ہر وقت گرم رہا مرہٹے نہ خود چین سے بیٹھے نہ مغلوں کو چین لینے دیا۔ آخر شہزادہ اکبر کی بغاوت اور اس کے دکن جانے نے اورنگ زیب کو تشویش میں ڈال دیا اور یہ راجپوتانہ کی مہم سر کرنے کے بعد ۱۶۸۲ء میں دکن پہنچ گیا۔

۱۶۵۶ء میں محمد عادل شاہ کے انتقال پر اورنگ زیب نے بیجاپور پر دست تصرف بڑھایا۔ اس کے خلاف شیواجی نے مغلوں کا ساتھ دیا مگر بہت جلد مغلوں سے الگ ہو کر دکن کے مختلف حصوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ ستمبر ۱۶۵۷ء میں بیجاپور نے مغلوں سے صلح کرلی۔ شیواجی نے بھی مجبوراً صلح کے لئے ہاتھ بڑھایا چوں کہ جنوری ۱۶۵۸ء میں شاہجہاں کی علالت کی وجہ سے اورنگ زیب شمالی ہند کو لوٹ رہا تھا اس لئے شیواجی کی درخواست کو بھی قبول کر لیا۔

شیواجی موقع کا منتظر ہی تھا اورنگ زیب کے دکن چھوڑنے کے بعد فوراً تاخت و تاراج اور قبض و تصرف کا کام شروع کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے کلیان اور بھیونڈی پر قبضہ کیا اور اس کے بعد پے در پے ملک کے مختلف قلعے فتح کرتا چلا گیا۔ ۱۶۵۹ء تک اس نے

اتنا علاقہ فتح کر لیا تھا کہ تقریباً چالیس قلعے شیواجی کے مقبوضات میں تھے۔ بیجاپور کے سلطان کو شیواجی کا ہمیشہ اندیشہ رہا اور اس لئے سلطان اورنگ زیب سے صلح کے بعد شیواجی کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس کوشش میں بیجاپور کو افضل خاں ایسے سردار سے ہاتھ دھونا پڑا۔

شہزادوں کی جنگ ختم ہونے کے بعد اورنگ زیب نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور شیواجی کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو پسپا کرنے کے لئے جولائی ۱۶۵۹ء میں شائستہ خاں کو دکن کا صوبہ دار مقرر کیا۔ شائستہ خاں نے دکن آتے ہی شیواجی کے مقبوضہ قلعے فتح کرنا شروع کیا اور پنہالہ، چکن، پونا وغیرہ بہت قلیل عرصہ میں سر کر لئے۔ ۱۶۶۱ء میں شائستہ خاں کونکن کی طرف متوجہ ہوا اور اس علاقہ کا بھی تھوڑا بہت حصہ فتح کر لیا۔ ۱۶۶۳ء میں ایک رات مرہٹوں نے شائستہ خاں پر شبخون مارا اور مغل فوج کو کافی نقصان پہنچایا۔ اورنگ زیب نے اس سانحہ کے بعد شائستہ خاں کی جگہ پر شہزادہ معظم کو بھیجا۔

۱۶۶۴ء میں شیواجی نے سورت کو لوٹا تو اورنگ زیب نے راجہ جے سنگھ کو دکن بھیجا۔ راجہ نے آتے ہی اپنے فوجی اور سیاسی تجربہ سے کام لیا۔ مغلوں نے جب پرندھر، وجر گڈھ وغیرہ فتح کر لئے تو شیواجی ہمت ہارنے لگا اور صلح کی درخواست کی۔ راجہ جے سنگھ نے فوراً درخواست منظور کر لی اور پرندھر میں معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کی رو سے مغلوں کو تقریباً ۲۳ قلعے ہاتھ لگے۔ اسی موقع پر راجہ نے شیواجی کو آگرہ جانے پر بھی آمادہ کر لیا تاکہ مغلوں کے ایک بڑے دشمن کا قلع قمع ہو جائے لیکن شیواجی اورنگ زیب کے سلوک سے خوش نہ ہوا اور ۱۶۶۶ء میں بھاگ کر دکن واپس آگیا۔ دکن آنے کے بعد شیواجی قریب تین سال تک خاموشی سے تیاری کرتا رہا۔

۱۶۵۷ء میں اورنگ زیب اور بیجاپور کے درمیان معاہدہ ہوا تھا لیکن چوں کہ سلطان نے اس پر عمل نہیں کیا اس لئے ۱۶۶۵ء میں راجہ جے سنگھ نے بیجاپور کے خلاف جنگ شروع

کی۔ یہ جنگ کئی مہینوں جاری رہی مگر مغلوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عادل شاہ ثانی نے ۱۶۶۱ء سے ۱۶۶۶ء تک اپنی غیر معمولی سیاسی اور فوجی لیاقت سے کام لیا لیکن اس کے بعد یہ عیش وعشرت میں پڑ گیا اسی وقت سے اس سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ ۱۶۷۲ء میں سلطان کے انتقال پر اس کے چار سالہ بیٹے سکندر عادل شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا اس زمانہ میں حکومت کا نظم ونسق وزیروں کے ہاتھ میں تھا آپس میں خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں مغلوں نے ان خانہ جنگیوں اور ملکی اور غیر ملکی کے سوال سے بہت فائدہ اٹھایا۔ شہزادہ معظم کی جگہ بہادر خاں کو دکن بھیجا گیا۔ بہادر خاں نے آنے کے بعد بیجاپور پر حملہ کر دیا مگر وزیر خواص خاں نے صلح کر لی یہ صلح عارضی تھی۔ ۱۶۷۶ء میں بہادر خاں نے دوبارہ جنگ چھیڑ دی اور نلدرگ اور گلبرگہ پر قابض ہو گیا۔ بیجاپور نے اس وقت بھی مغلوں سے معاہدہ کیا مگر گلبرگہ کے معاہدہ پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے ۱۶۷۹ء میں بہادر خاں نے پھر بیجاپور پر حملہ کیا۔ مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی اس ناکامی کا بڑا سبب یہ ہے کہ مغل سرداروں میں اختلاف رائے اور ذاتیات کی وجہ سے اتحاد عمل قائم نہیں ہا تھا۔

۱۶۷۷ء میں مغلوں نے گولکنڈہ کی طرف رخ کیا۔ شیواجی کی امداد کرنے کے جرم پر گولکنڈہ سے مغلوں نے ایک کروڑ روپیہ اور دس ہزار گھوڑے بطور جرمانہ طلب کئے۔ جب سلطان نے ادائگی سے انکار کیا تو مغلوں نے جنگ کا اعلان کیا۔ مقام مال کھیڑ پر دونوں کے درمیان جنگ ہوئی مگر دلیر خاں نے بہت جلد گولکنڈہ سے صلح کر لی۔

تین سال کی تیاری کے بعد شیواجی نے پھر لوٹ مار شروع کر دی۔ ۱۶۷۰ء میں دوبارہ سورت کو لوٹا اور اسی سال کے دسمبر میں برار، خاندیش برہان پور وغیرہ کو تاراج کیا ۱۶۷۲ء میں سورت کے تاجروں اور متصدیوں سے پھر چار لاکھ روپیہ طلب کیا۔ اسی سال عادل شاہ ثانی کے انتقال کے بعد شیواجی نے کناڈا کے علاقہ کو لوٹا۔ ۱۶۷۳ء میں دلیر خاں نے

ادھر کوکن میں مرہٹوں کے مقبوضات پر حملے شروع کئے مگر شیواجی نے مغلوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ ۱۶۷۷ء میں شیواجی نے کرناٹک کا بھی تھوڑا حصہ فتح کرلیا تھا۔ ۱۶۸۰ء میں شیواجی مرگیا غرض اس وقت تک شیواجی نے دکن و گجرات کو تباہ کر دیا تھا جس سے جان و مال کا بے انتہا نقصان ہوا۔ شیواجی کے بعد اس کا بیٹا شمبھوجی تخت و تاج کا مالک ہوا۔ شمبھوجی نے پہلے اپنے مقبوضات کی حفاظت کا انتظام کیا اور اس کے بعد مغلوں سے جنگ چھیڑی اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۶۸۱ء میں مرہٹوں نے برہان پور اور بہادر پور (برہان پور سے تین میل کے فاصلہ پر) کو لوٹا۔

۱۶۸۱ء میں شہزادہ اکبر دکن چلا آیا۔ اورنگ زیب بھی راجپوتانہ سے اپنے تجربہ کار سرداروں کو لے کر مارچ ۱۶۸۲ء میں دکن پہنچ گیا۔

اورنگ زیب نے اورنگ آباد میں مقام کیا اور سب سے پہلے مغل قلمرو کی سرحدوں پر مضبوط پہرے بٹھلادے تاکہ شہزادہ اکبر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اورنگ زیب نے دکن کے مختلف حصوں پر اعلیٰ افسروں کی کمان میں فوجیں روانہ کیں حسن علی کو کوکن بھیجا اس نے آسانی سے کلیان پر قبضہ کرلیا۔ خان جہاں کو حکم ہوا کہ وہ بہادر گڑھ کو صدر مقام بنائے اور مرہٹوں پر حملے کرے۔ شہزادہ اعظم اور دلیر خاں کو جنوب میں احمد نگر کی طرف روانہ کیا۔ اور شہاب الدین اور دلیر اور کو مغربی سرحد ناسک روانہ کیا۔ اورنگ زیب نے اس طرح مرہٹوں پر کافی دھاک بٹھادی اور مرہٹوں کی لوٹ مار اور قبض و تصرف کے طوفان کو بڑی حد تک قابو سے باہر نہ ہونے دیا۔

چوں کہ اورنگ زیب اب مرہٹوں کے خلاف بڑے پیمانے پر جنگ کا آغاز کرنا چاہتا تھا اس نے ۱۶۸۳ء میں اپنی تمام بکھری ہوئی فوجوں کو واپس بلالیا۔ ادھر شمبھوجی مغلوں کی طرف سے ذرا مطمئن ہوا تو اس نے پرتگیزوں کے مقبوضات پر حملے شروع کئے جنگوں کا سلسلہ قریب

دس مہینے رہا اور اس دوران میں دمن سے بسین تک کے کئی مقامات پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا تھا لیکن شہزادہ معظم نے جیسے ہی کوکن پر حملہ کیا تو شمبھوجی نے پرتگیزوں سے صلح کر لی مگر یہ صلح قلیل مدت رہی معظم کی فوج کو کوکن میں قحط اور وبا سے بڑا نقصان پہنچا تو شمبھوجی نے مغلوں کی طرف سے مطمئن ہو کر دوبارہ پرتگیزوں سے جنگ چھیڑ دی مگر اس کے بعد صلح ہو گئی۔

۱۶۸۳ء میں اورنگ زیب احمد نگر آیا اور پھر مختلف سرداروں کی کمان میں فوجیں روانہ کیں۔ ۱۶۸۴ء کے اوائل میں مغل فوجیں فتح مند رہیں اسی زمانہ میں شمبھوجی کے خاندان کے افراد کو بہادر گڑھ سے قید کر لیا۔ ۱۶۸۵ء کے وسط تک مغل مرہٹوں کے بے شمار مقبوضات پر قابض ہو گئے۔

اپریل ۱۶۸۵ء میں بیجاپور کے محاصرہ کا آغاز کیا گیا۔ خود اورنگ زیب احمد نگر سے شولا پور پہنچ گیا تھا تاکہ نگرانی کر سکے۔ ادھر گول کنڈہ پر بھی پہرہ بٹھا دیا تاکہ بیجاپور کو اس طرف سے مدد نہ پہنچ سکے۔ اس محاصرہ کے ابتدائی مہینوں میں قحط اور وبا سے مغلوں کو بڑا نقصان پہنچا۔ اٹھارہ مہینے بیجاپوریوں نے مقابلہ کیا آخر سلطان نے ہتھیار ڈال دیے اور ۱۶۸۶ء میں ۱۲ ستمبر کو قلعہ مغلوں کے حوالے کر دیا۔ سکندر عادل شاہ کو قید کر دیا گیا ــــ ایک ہفتہ کے بعد اورنگ زیب شہر میں داخل ہوا اور جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔

گولکنڈہ کا نظام حکومت بھی اس وقت تک درہم برہم ہو چکا تھا۔ ابوالحسن داد عیش دے رہا تھا اور زمام حکومت دو برہمن بھائی اکنا اور مدنا کے ہاتھ میں تھی۔ مدنا ۱۲ سال خود مختار وزیر رہا۔ اور اس دوران میں بد نظمی پھیلی ہوئی تھی اور یہ ظلم و استبداد کا دور تھا۔ اورنگ زیب بیجاپور سے فارغ ہو کر گول کنڈہ کی طرف متوجہ ہوا۔ سات ماہ کے سخت محاصرہ کے بعد ستمبر ۱۶۸۷ء میں مغل فتح مند ہوئے اور دکن کی یہ ریاست بھی مغل قلمرو میں شامل کر دی گئی۔ ابوالحسن کو بھی

دولت آباد کے قلعہ میں قید کر دیا گیا

بیجاپور اور گولکنڈا سے فراغت پاکر اورنگ زیب پھر مرہٹوں کی طرف متوجہ ہوا شمبھوجی کو جب مغلوں کے حملوں کی خبر ہوئی تو یہ سنگ میشور چلا گیا مگر مقرب خاں نے سنگ میشور پر اچانک حملہ کر دیا اور شمبھوجی کو قید کر لیا۔ شمبھوجی کا چھوٹا بھائی راجہ رام یہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ مرہٹوں نے اسے تخت پر بٹھلایا اور مغلوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ مغلوں نے جنجی کے قلعہ کا محاصرہ کیا اور ۱۶۹۸ء میں یہ قلعہ فتح کر لیا۔ راجہ رام یہاں سے بھاگ کر ستارا گیا۔ مغلوں نے فوراً ستارہ کا محاصرہ کیا ۱۷۰۰ء میں راجہ رام مر گیا اور مرہٹوں کے منصوبے خاک میں مل گئے۔ راجہ رام کے بعد مرہٹوں نے مغلوں سے صلح کر لی۔ ۱۷۰۶ء میں اورنگ زیب بیمار پڑا اور احمد نگر گیا۔ جہاں مرض الموت نے اس پیکر عمل کو ہمیشہ کے لئے چین کی نیند سلا دیا۔

بد نظمی :۔ اگرچہ اورنگ زیب اپنے ملک کے گوشہ گوشہ سے ہر وقت باخبر رہتا تھا اور ہر علاقہ کے نظم ونسق کو درست رکھنے کی اس نے ہر ممکن کوشش کی لیکن چونکہ اورنگ زیب نے جنگ وجدال سے آخری دم تک فرصت نہ پائی اس لئے اس قدر وسیع مملکت کے نظام کو تخریب سے بچانے میں زیادہ کامیاب نہ ہوا۔ اعلیٰ افسر اور شاہی ملازمین اپنے علاقوں میں بہت خود مختاری سے کام لیتے تھے۔ اورنگ زیب کے مصروف جنگ ہونے کی وجہ سے انہیں باز پرس کا خوف کم تھا۔ رعایا پر ان کا ظلم واستبداد حد سے گذر چکا تھا۔ ملک کی اقتصادی حالت خراب ہونے کی وجہ سے ملازمین کو مہینوں تنخواہیں نہیں ادا کی جاتیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ رشوت اور حصول زر کے ناجائز طریقے عام ہوتے گئے۔

زراعت :۔ ملک کا دارومدار زراعت اور تجارت پر تھا مگر اس دور میں زراعت کی حالت ابتر تھی۔ خصوصاً دکن کی پچیس سالہ جنگ نے دکن و گجرات کی زراعت کو تباہ و برباد

کر دیا تھا۔ فوجوں کی نقل و حرکت اور ان کی ضروریات نیز سپاہیوں کی بے احتیاطی نے سبزہ زاروں کی جگہ ویران بنجر زمین کا منظر پیش کر دیا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر کسان بھی بے دلی سے کاشتکاری کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلہ گراں ہوتا گیا مزید برآں آفات سماوی و ارضی نے بھی زراعت کو نقصان پہنچایا۔ اگرچہ ملک کے دوسرے علاقوں میں غلہ کی فراوانی تھی مگر چوری ڈاکہ کے خطروں سے غلہ کی نقل و حرکت مسدود تھی۔ کسان اس دور میں ایک تو ان آفات کا شکار رہا اور دوسری طرف زمینداروں کے ظلم و ستم نے اس کی مصیبتوں میں اضافہ کر دیا تھا۔

سیاسی بدامنی کے باوجود تجارت کو زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ انگریزوں نے اسی عہد میں ملک کے مختلف حصوں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ شیواجی کی لوٹ کھسوٹ سے کچھ مدت کے لئے تجارت کی منڈیاں سرد ہو جاتی تھیں لیکن سمندر پار کے ملکوں سے تجارت میں زیادہ نقصان نہ ہوا۔ اورنگ زیب کے آخری بیس سال میں بحری ڈاکوؤں کا زور بڑھ گیا تھا مگر اس کے باوجود تجارت میں فرق نہ آنے پایا۔

اقتصادی حالات:۔ سالہا سال کی جنگوں نے شاہی خزانہ میں خلاء پیدا کر دیا تھا آمدنی کے ذرائع مسدود ہوتے جا رہے تھے۔ زراعت کو نقصان پہنچنے سے محصول کی رقم کم ہوتی گئی دشمنوں کے اعلیٰ افسروں کو رشوت دینے میں کافی خرچ ہوتا۔ اورنگ زیب نے اپنے آبا و اجداد کی جمع کی ہوئی دولت کا بھی بیشتر حصہ ختم کر دیا تھا۔

ملک میں بیکاری اور بدنظمی کی وجہ سے بدمعاش عنصر نے چوری ڈاکہ کے طریقوں کو عام کر دیا تھا۔ راجپوتوں کا پیشہ سپاہ گری تھا مگر انھوں نے بھی ڈاکہ زنی کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ شہر اور دیہات کسی جگہ امن و سکون کا نام و نشان نہیں پایا جاتا تھا۔ غرض اورنگ زیب کے انتقال کے وقت ملک بدحالی کا شکار تھا۔

اورنگ زیب کا عہد جس طرح سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اسی طرح مذہبی حیثیت سے بھی یہ ایک خاص اہمیت کا مالک ہے دینی امور میں اس کا مسلک اپنے جد بزرگوار اکبر کے مسلک سے بالکل مختلف ہے۔ اکبر کی وسیع المشربی اور کشادہ دلی کسی قسم کے امتیازات کو جو مذہب اور نسل کی بنا پر قائم ہوں روا نہ رکھتی تھی۔ اسلامی حکومت کے آغاز ہی سے ہندی و ایرانی تہذیب کے درمیان مفاہمت و مصالحت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے لیکن اکبر کا عہد وہ زریں دور ہے جب ان دو تہذیبوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے حکمراں طاقت نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں استحکام سلطنت کے لئے اکبر سماجی ہم آہنگی اور مختلف مذاہب کے درمیان اتحاد و مفاہمت کو بہت ضروری قرار دیتا تھا۔ وہ صلح کل کے نشہ میں اس درجہ سرشار تھا کہ اس کے بعض اقدامات کو راسخ العقیدہ مسلمانوں نے جادۂ دین سے کلی انحراف پر محمول کیا۔ مسلمانوں کے سخت ردعمل کے باوجود رواداری اور کشادہ دلی کی اس روش کو جس کی بنیاد اکبر نے ڈالی تھی جہانگیر اور شاہجہاں کے لئے یکسر بدلنا بڑا مشکل تھا۔ اکبر کے زمانہ سے دو قوتیں ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار نظر آتی ہیں۔ ایک قوت وسیع المشربی اور مذہبی قیود سے بے نیازی کی ہے اور دوسری قوت راسخ الاعتقادی کی جو وسیع المشربی اور صلح کل کے مسلک کو بے دینی اور بے اعتدالی تصور کرتی تھی۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کے سب سے زبردست نمائندے حضرت مجدد الف ثانی تھے جنہوں نے وحدت وجود کی بے اعتدالیوں کا خم ٹھونک کر مقابلہ کیا۔ مجدد صاحب اور ان کے جانشینوں کی مساعی سے اورنگ زیب کی صورت میں ظہور کیا۔ دوسری جانب جس غرض سے اکبر نے دین الٰہی کی بنیاد ڈالی تھی۔ مختلف مذاہب کے نمائندوں کے درمیان تبادلۂ خیال کے لئے عبادت خانہ تیار کرایا تھا تصوف اور ہندو فلسفہ میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اس مقصد کے حصول کے لئے اسی کے خاندان سے ایک شہزادہ اٹھا جو وحدت وجود کے رنگ میں رنگا ہوا

تھا۔ جو اسلام مجازی سے بیزار اور کفر حقیقی کا دلدادہ تھا۔ جو ایک طرف صوفیائے کرام اور خاص طور پر حضرت میاں میر قادری اور ان کے مرید ملا شاہ بدخشی کا حلقہ بگوش تھا اور دوسری طرف اپنشد کو توحید کا سرچشمہ سمجھتا تھا اور وحدت ادیان کا دل سے قائل تھا۔ ایک طرف وہ سفینۃ الاولیاء، سکینۃ الاولیاء اور حسنات العارفین لکھ کر صوفیہ کے مقدس گروہ کے ساتھ اپنی عقیدت اور وابستگی کا ثبوت دیتا ہے اور دوسری طرف اپنشد کے فارسی ترجمہ (سر اکبر) اور مجمع البحرین کی تالیف سے اپنی وسیع المشربی اور فراخ دلی کا اظہار کرتا ہے۔ دارا اور اورنگ زیب اپنے اپنے مسلک پر گامزن تھے۔ اورنگ زیب شریعت کا پابند تھا اور دارا طریقت کا سالک۔ دونوں کے مذہبی خیالات میں بعد المشرقین تھا۔ دور حاضر کے بعض مورخ اورنگ زیب و دارا کی باہمی جنگ کو عقیدہ و نظریہ کی کشمکش کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اورنگ زیب کے خطوط میں دارا کی بے دینی و الحاد کا بار بار ذکر آیا ہے لیکن اسے اس بات پر کیوں نہ محمول کیا جائے کہ یہ الحاد و بے دینی کا الزام سیاسی حریف کو نیچا دکھانے کے لئے ایک موثر حربہ تھا۔ اورنگ زیب نے اپنے نظریہ کے مطابق اسلامی اصولوں پر حکومت چلانے کی کوشش کی۔ شریعت کے احکام رعایا کے لئے لازم و ملزوم قرار دیئے لیکن تمام کاوش و کاہش کے باوجود اورنگ زیب حصول مطلب میں زیادہ کامیاب نہ ہوا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ ابھی شاہجہاں کے دور کی رنگ رلیاں لوگوں کو بھولی نہیں تھیں۔ صوفیوں نے دوکانداری قائم کر رکھی تھی اور توکل و قناعت کے غلط معنی سمجھا کر عوام کو بے وقوف بنا رکھا تھا۔ شریعت کی جکڑ بندیوں کے مقابلہ میں طریقت کو آزادی خیال کرتے آرام طلب طبیعتیں اس طرف مائل ہونے لگیں۔ لوگوں کے اس رجحان کی سب سے بڑی وجہ اس زمانہ کے علمائے دین کی تنگ نظری تھی۔ مقدسین کے اس فرقہ نے اسلام کو ہوّا بنا کر پیش کیا لہٰذا عوام نے ان کی سختیوں سے نجات پانے کے لئے تصوف میں پناہ لی۔ اس طرح اس دور میں الحاد و بے دینی کو تقویت مل گئی اور اس کا زور بڑھتا گیا۔ منجموں اور رمالوں کی قدر بڑھ گئی۔ لوگ تقدیر پر بھروسہ

کرنے لگے، اور اس طرح عمل اور تدبیر کے دروازے مسدود ہوتے گئے۔ تصوف کا زور ہونے سے مرشد پرستی بڑھ گئی صرف مسلمان ہی اس فعل کے مرتکب نہیں بلکہ سکھوں اور ہندوؤں میں بھی یہ بدعت بدرجۂ اتم موجود تھی ہندوستانیوں میں توہم پرستی کا عام ہونا اس زمانہ میں عقل و شعور کے زوال کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اگرچہ اورنگ زیب نے اخلاقی اصلاحات کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی۔ اور یہ خداترس شراب، جوا اور بداخلاقی کی سختی سے روک تھام کرتا رہا مگر افسوس کہ اس کا ردعمل بہت برا ہوا۔ قحط سالی، جنگ و جدال اور اونچے طبقے کی بے پناہ عیاشی کی وجہ سے بد دیانتی کا زور بڑھ گیا تھا۔

گجرات:- چوں کہ ولی کا گجرات سے گہرا تعلق ہے اور اس کی عمر کا بیشتر حصہ بھی گجرات میں بسر ہوا ہے اس لئے ضروری ہے کہ عہد اورنگ زیب میں گجرات کے سیاسی، سماجی اور علمی حالات کا جائزہ لیا جائے مرہٹوں کی تاخت و تاراج دکن تک ہی محدود نہ تھی بلکہ گجرات اپنے تمول اور دولت مندی کی وجہ سے ان قسمت آزماؤں کے لئے بہت بڑی کشش کا باعث تھا۔

۱۰۶۷ھ میں گجرات کی صوبہ داری کے فرائض شہزادہ مراد بخش انجام دے رہا تھا۔ اس نے شاہجہاں کی علالت کا پتہ چلتے ہی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور احمد آباد سے سورت اور سورت سے اجین کا رخ کیا۔ اس کا مفصل ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ راجہ جسونت سنگھ کو گجرات کا صوبہ دار تجویز کیا گیا۔ راجہ اپنا عہدہ سنبھالتے ہی نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوا۔ رحمت خاں دیوان صوبہ، محمد بیگ خاں ترکمان وغیرہ جو دارا کے ساتھ چلے گئے تھے واپس آئے۔ راجہ نے اورنگ زیب سے ان کی سفارش کی۔ اورنگ زیب نے انھیں معاف کر دیا اور دوبارہ رحمت خاں کو دیوان صوبہ مقرر کیا اور قطب الدین خاں کو سورٹھ کا فوجدار بنا کر بھیجا۔ بہار سنگھ کو جس نے دارا کو دوسری بار گجرات میں پناہ نہیں دی خلعت فاخرہ کے ساتھ کچھ دیہ کی فوجداری عنایت کی گئی۔ ۱۶۶۱ء میں راجہ جسونت سنگھ کو شیواجی کی سرکوبی کے لئے دکن بھیج دیا گیا۔ اور مہابت خاں کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا گیا اور کرامت خاں و حاجی شفیع خاں کو دیوان صوبہ بنایا گیا۔

کاٹھیاواڑ میں ابتدائی دور میں زمینداروں کی شورشوں نے بدامنی پھیلا رکھی تھی۔ ۱۶۶۲ء میں نوانگر کے جام رن مل سنگھ کے انتقال پر اس کے بیٹے چھترسال کو نامزد کیا گیا مگر چھترسال کے چچا رائے سنگھ نے اس کی مخالفت کی اور اسے قید کر دیا۔ چھترسال نے مغلوں سے مدد کی درخواست کی تو قطب الدین فوجدار سورٹھ نے اپنے بیٹے محمد خان کو چھترسال کی مدد کے لئے بھیجا۔ اس جنگ میں رائے سنگھ نے زک اٹھائی مغلوں نے دوبارہ چھترسال کو اس کی جاگیر سپرد کی اور نوانگر کو اسلام نگر کا نام دیا۔ اس واقعہ کے بعد بھی رائے سنگھ کے بیٹے تماجی اور نوانگر کے زمیندار بختاجی نے بھی کچھ مدت تک بدامنی پھیلا رکھی تھی۔

شیواجی کی حوصلہ مند طبیعت سورت کی بے انتہا دولت اور زر و سیم کو حاصل کرنے کے لئے عرصہ سے مچل رہی تھی آخر موقع پاتے ہی ۱۶۶۴ء میں شیواجی نے سورت پر پہلا حملہ کر دیا اور کئی دن تک شہر کو دل کھول کر لوٹا۔ اس سلسلہ میں اہل سورت پر اس نے جو ستم ڈھائے وہ بیان سے باہر ہیں تین روز تک شہر میں خون کی ندیاں بہتی رہیں اور آگ کے شعلے آسمان تک پہنچتے تھے۔ جب مہابت خاں کو اس کی اطلاع پہنچی تو یہ علاقہ کے فوجداروں اور زمینداروں کی فوجوں کے ساتھ سورت کی طرف بڑھا مگر اس وقت تک شیواجی سورت سے کئی لاکھ روپیہ لے کر جا چکا تھا۔

۱۶۶۵ء میں گجرات کے متصدیوں کے نام ایک فرمان صادر ہوا جس کی رو سے بہت سے ابواب (ٹیکس) معاف کر دئے گئے اسی فرمان سے مذہب سے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے بارے میں اورنگ زیب کے طرزِ عمل پر روشنی پڑتی ہے ۱۶۶۸ء میں مہابت خاں کی جگہ پر الہ آباد کے صوبہ دار بہادر خاں خان جہاں کو بھیجا گیا اور حاجی شفیع خاں کی جگہ پر محمد ہاشم دیوان مقرر ہوا۔ خان جہاں احمد آباد میں بہت قلیل مدت رہا اس نے احمد آباد میں ایک مسجد اپنی یادگار چھوڑی ہے جو گایکواڑ کی حویلی محلہ رائے کھڑ میں واقع ہے۔ اور دریاپور کے دروازہ کے قریب اپنے نام محمد پناہ کی نسبت سے ایک محلہ پناہ پور آباد کیا تھا۔ اس نے اپنے عہد صوبہ داری میں کئی اور عمارتیں بھی تعمیر کرائی تھیں۔ ۱۶۷۰ء میں خان جہاں کو دکن بھیجا گیا۔ اسی سال

راجہ جسونت سنگھ کو دوبارہ گجرات کی صوبہ داری تفویض ہوئی۔ اس زمانہ میں شیواجی نے دوبار گجرات میں لوٹ مار کی۔
۱۶۷۲ء میں راجہ جسونت سنگھ کو گجرات سے بلا لیا گیا اور اس کی جگہ پر میر جملہ کے بیٹے محمد امین کا تقرر کیا گیا۔ اس دور میں گجرات کو چند آفات سماوی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اسی زمانے میں اودے پور کے رانا کے چھوٹے بیٹے بھیم سنگھ نے گجرات کے دو بڑے متمول شہروں ویسل نگر اور وڈ نگر کو لوٹا اور تاراج کیا اور ایڈر کے راجہ کی شرکت سے گجرات میں شورش برپا کر دی۔ اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے محمد امین نے محمد بہلول شیروانی کو بھیجا۔ ایڈر کے راجہ نے اپنے قلعہ میں پناہ لی مگر محمد بہلول نے قلعہ پر حملہ کر کے راجپوتوں کو شکست دی اور انھیں تتر بتر کر دیا۔ ۱۶۷۴ء اور ۱۶۷۵ء میں شیواجی کے پیہم حملوں سے گجرات میں پھر بدامنی پھیل گئی اور تجارت کو بہت نقصان ہوا۔ ۱۶۸۲ء میں محمد امین نے احمد آباد میں انتقال کیا۔ اس کا مزار بھدر کے قلعہ میں ہے۔ اورنگ زیب محمد امین کا بڑا مداح تھا۔

محمد امین کے انتقال کے بعد مالوہ کے صوبہ دار مختار خاں کو گجرات بھیجا گیا۔ اور سورٹھ شہزادہ محمد اعظم کو تفویض کیا گیا اسی اثناء میں مختار خاں نے وفات پائی تو گجرات کی صوبہ داری بھی محمد اعظم کو دی گئی ۱۶۸۴ء میں کار طلب خاں بعدہٗ شجاعت خاں کو سورت سے طلب کر کے نائب صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ سورت کی متصدی گری صلابت خاں کو عنایت ہوئی۔

شجاعت خاں گجرات کا بہت مقبول صوبہ دار گذرا ہے ۱۶۸۵ء سے ۱۷۰۱ء تک یعنی ۱۶ سال شجاعت خاں نے گجرات میں بہت ہی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ اس کو جودھپور کا فوجدار بھی مقرر کیا گیا تھا تاکہ درگاداس راٹھور کے مقابلہ میں اس سے مدد ملتی رہے یہ چھ ماہ گجرات میں رہتا اور چھ ماہ مارواڑ میں قیام کرتا۔ تیبوں اور رموسنوں کی شورش اسی دور میں برپا ہوئی تھی۔ اس شورش کا حال آگے تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

اس ہردلعزیز حاکم نے ۱۶۸۵ء میں بمقام احمد آباد انتقال کیا۔ اورنگ زیب کو اس کے انتقال سے بہت ملال ہوا۔ شجاعت خاں کی خدمات جلیلہ کے صلہ میں اس کی جائداد قانون کے مطابق ضبط نہیں کی گئی اور یہ رعایت دی گئی کہ اس کے ورثہ میں تقسیم کردی جائے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہندو عورتیں اپنے گیتوں میں اس کے نظم و نسق کی تعریفیں کرکے خراج تحسین پیش کرتیں۔ احمد آباد میں اس نے ۱۶۹۵ء میں ایک عالی شان مسجد و مدرسہ تعمیر کرایا تھا جو اب تک موجود ہے اسی کے پہلو میں اس کو سپرد خاک کیا گیا ہے۔

شجاعت خاں کے بعد شہزادہ محمد اعظم کو گجرات اور مارواڑ بہ ضمیمہ اجمیر کی صوبہ داری تفویض کی گئی اور خواجہ عبدالحمید خاں کو نائب صوبہ دار تجویز کیا گیا اسی سال شہزادہ محمد اعظم نے احمد آباد پہنچ کر گجرات کا نظم و نسق سنبھالا۔ شیواجی نے اپنی زندگی میں گجرات کو امن سے نہ رہنے دیا مگر اس کے بعد بھی مرہٹوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ اکثر گجرات میں پھیل جاتے اور لوٹ مار مچاتے تھے۔ سنہ ۱۷۰۱ء میں قریب بارہ ہزار مرہٹے نربدا پار اطراف میں پھیل گئے اور سورت اور برہان پور سے کافی دولت لے گئے۔ ۱۷۰۵ء میں مرہٹہ دھنا جادھو قریب اسی ہزار فوج کے ساتھ گجرات پر حملہ آور ہوا۔ عبدالحمید خاں نے پہلے گجرات کے مختلف خطوں کے فوجدار شاہ ادر صفدر خاں بابی اور نظر علی خاں جیسے اعلیٰ افسروں کو اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا لیکن ڈیڑھ ماہ تک مغل فوجیں نربدا کے کنارے داد عیش دیتی رہیں اور کوئی جنگ وقوع میں نہ آئی۔ مرہٹوں نے بڑودہ کے قریب بابا پیادہ کے قریب ڈیرے تنبو ڈال لئے۔ آخر جنگ ہوئی اور نظر علی خاں سے معاہدہ کیا مگر جیسے ہی عبدالحمید خاں احمد آباد سے لشکر لے کر نربدا تک پہنچا تو مرہٹوں کو تشویش ہوئی اور دوبارہ زوروں کی لڑائی ہوئی۔ اس جنگ میں بہت سے افسر کام آئے اور نظر علی اور عبدالحمید خاں مرہٹوں کے ہاتھ قید ہوئے ان دونوں کے لئے مرہٹوں نے بہت بڑی رقمیں مقرر

کی تھیں۔ عبدالحمید خاں نے تھوڑی سی رقم ادا کی اور بقیہ کے لئے اپنے برادرزادہ اور ہمشیرزادہ کو ضمانت پر مرہٹوں کے سپرد کیا اور خود بقیہ رقم کا انتظام کرنے کے لئے احمد آباد آیا۔ اتفاق سے مرہٹوں میں کسی بات پر آپس میں مناقشہ ہوا تو یہ دونوں موقع پاتے ہی وہاں سے بھاگ نکلے۔ مرہٹے بھی سورت اور نواح سورت کو ویران کرتے ہوئے دکن کی طرف لوٹ گئے۔

شہزادہ محمد اعظم گجرات کی آب و ہوا موافق نہ آنے کی وجہ سے برہان پور چلا گیا۔ اس کی جگہ پر کشمیر کے صوبہ دار ابراہیم خاں کا تقرر کیا گیا۔ ابراہیم خاں کے دور میں بالاجی بشونا تھ گجرات پر حملہ آور ہوا۔ گذشتہ وقت دھنا جادھو کے حملہ کے بعد سے مرہٹوں کے حوصلے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ احمد آباد سے چار میل کے فاصلہ پر قریب بٹوہ کے ان کی فوجوں نے ڈیرے تنبو ڈالے۔ مغل فوجوں نے بھی شہر پناہ کے قریب کانکریا تالاب پر مقام کیا۔ عبدالحمید خاں اور نظر علی خاں جیسے نبرد آزما بھی مرہٹوں سے مقابلہ کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ اس وقت اورنگ زیب کا انتقال ہو چکا تھا اور تخت و تاج کا مالک کون شہزادہ ہوگا یہ معلوم نہ تھا ان وجوہ کی بنا پر ابراہیم خاں سے افسران اعلیٰ نے مشورہ کیا اور بالاجی بشونا تھ کے پاس صلح کے لئے وفد بھیجا۔ آخر کار دو لاکھ کھنڈنی دے کر بالاجی کو گجرات سے واپس لوٹایا۔ مرہٹوں نے اطراف و اکناف میں اتنا خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا کہ دیہاتیوں نے شہر احمد آباد میں پناہ لی تھی۔ ابراہیم خاں کے دور میں دوسرا واقعہ 'کڑی' مقام کے کولیوں کی شورش کا پیش آیا لیکن اسے بہت جلد دبا دیا گیا۔ ابراہیم خاں کے مستعفی ہونے کے بعد گجرات کی صوبہ داری غازی الدین فیروز جنگ کو تفویض کی گئی۔ غازی الدین ۱۷۰۸ء میں احمد آباد آیا اور نظم و نسق سنبھالا۔

اورنگ زیب کے بعد دہلی کے تخت پر کوئی ایسا سخت گیر سیاست داں اور مدبر حکمراں نہ آیا جو ایسی وسیع سلطنت کو سنبھال سکتا اور اپنی ذمہ داریوں کو اپنی لیاقت سے انجام دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی سرکشوں کے حوصلے بڑھ گئے جنھوں نے پورے

ملک میں بدنظمی اور بدامنی کا دور قائم کر دیا۔

اورنگ زیب کے مذہبی خیالات آپ دیکھ چکے ہیں۔ اپنے طرز عمل کا ثبوت یہ گجرات کی صوبہ داری کے دور میں بھی دے چکا ہے۔ ۱۶۴۵ء میں احمد آباد کا ایک عالی شان جین مندر "چنتامنی" کسی خاص وجہ سے اورنگ زیب کے حکم سے بند کر دیا گیا اور اس کی جگہ پر ایک مسجد "قوت الاسلام" تعمیر کرائی جانے لگی۔ جب اس واقعہ کی اطلاع شاہجہاں کو ملی تو ۱۶۴۸ء میں یہ مندر جینیوں کو اس شرط پر لوٹایا گیا کہ جس حصہ پر مسجد تعمیر ہو چکی ہے اسے چھوڑ کر بقیہ حصہ کو مندر کے کام میں لیا جائے۔ اسی مندر کے مالک و متولی شانتی داس جوہری کو شاہجہاں نے ۱۶۵۶-۵۷ء میں پرگنہ شتر بجیہ (پالیتانہ) شتر بجیہ کے مندر کے لئے عنایت کیا تھا۔ ۱۶۵۷ء میں جب مراد بخش صوبہ دار گجرات نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تو اس نے شانتی داس کے نام اسی فرمان کو تازہ کیا تھا۔ ۱۶۵۸ء میں جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو شانتی داس نے اپنے پانچ لاکھ پچاس ہزار روپیہ جو مراد بخش نے بطور قرض اس سے لیا تھا نیز پرگنہ شتر بجیہ کے لئے حضور اقدس میں درخواست کی۔ اورنگ زیب نے گجرات کے متصدیوں کو قرض کی ادائگی کے لئے حکم دیا۔ شانتی داس کو ایک دوسرے فرمان کی رو سے شتر بجیہ، آبو، گرنار عبادت گاہوں کے لئے عنایت ہوئے۔

۱۶۶۵ء میں مہابت خاں کی صوبہ داری میں ایک فرمان صادر ہوتا ہے جس میں تقریب ۳۲ شقیں ہیں اور ان میں سے بیشتر اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس فرمان سے واضح ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے مسمار کردہ بت خانوں کے دوبارہ تعمیر کئے جانے کی سخت ممانعت کر دی تھی۔ ۱۶۶۵ء سے ۱۶۹۳ء تک ہمیں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس میں کسی مندر کو منہدم کیا گیا ہو۔ مگر ۱۶۹۳ء میں شجاعت خاں کے نام حکم صادر ہوا تھا کہ گجرات کے شہر وڈنگر کا ایک مندر ڈھا دیا جائے اسی طرح سن ۱۷۰۶ء میں اورنگ زیب نے عہدے داروں کو لکھا کہ سنا جاتا ہے کہ سومناتھ

کا مندر دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے اور وہاں عبادت کی جاتی ہے اگر ایسا ہے تو تحقیق کے بعد مندر کو منہدم کر دیا جائے۔

غرض سیاسی حالات یا مذہبی تعصب کی بنا پر گجرات میں اورنگ زیب نے یہ رویہ اختیار کیا تھا۔ جہاں اس کے عہد حکومت میں ایک یا دو مندر ڈھا دینے کا حوالہ ملتا ہے تو دوسری طرف منادر کے لئے جاگیریں بھی عنایت کرنے کا پتہ چلتا ہے۔

گجرات کے صوبہ دار کے نام ایک فرمان ایسا بھی پایا جاتا ہے جس کی رو سے مٹی کے ہاتھی گھوڑے (کھلونے) بنانے کی سخت ممانعت کی گئی تھی۔

۱۶۶۵ء کے فرمان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے ہندو تہوار اور مبارک دن جیسے پانچم۔ ایکادشی۔ اماوس پر دکانیں بند رکھنا ممنوع قرار دیا۔ اس حکم کا تعلق مذہب سے نہیں معلوم ہوتا۔ دکانیں بار بار بند رہنے سے بازار منڈی میں خرید و فروخت میں بڑی دقت پیش آتی تھی اور اس لئے ایسا حکم جاری کیا گیا تھا۔ اسی فرمان کی رو سے ہولی کا تہوار اور دیوالی پر چراغاں کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ فرمان میں یہ وجہ بتائی گئی کہ ہولی پر راستہ سے جانے والوں کے ہاتھوں میں سے چھڑیاں لے کر آگ میں ڈال دی جاتی ہیں نیز آگ جلانے کے موقع پر نازیبا الفاظ بولے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخلاقی اصلاحات کے پیش نظر کیا گیا تھا دیوالی پر چراغاں نہ کرنے دینے کے کیا اسباب تھے ان سے ہم واقف نہیں ممکن ہے کہ یہ اقتصادی حالات کے پیش نظر کیا گیا ہو۔ مسلمانوں کے عرس اور مقابر کی پرستش پر بھی ایسی ہی کڑی قید یں لگا دی تھیں۔

اورنگ زیب نے مسلمان کے ساتھ بھی مذہب کے معاملات میں کسی قسم کی رو رعایت نہیں کی۔ چوں کہ یہ سنت والجماعت تھا اس لئے اس نے شیعیت کو پھیلنے سے ہر طرح روکا۔ ۱۷۰۴ء۔۱۷۰۳ء میں بہ عہد نائب صوبہ دار خواجہ عبدالحمید خاں دو بوہرے عیلی اور تاج گجرات کے مختلف اضلاع میں

شیعیت پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب اس کی اطلاع اورنگ زیب کو ہوئی تو شہزادہ محمد اعظم صوبہ دار گجرات کو اس امر میں تحقیق کرنے کا حکم دیا۔ محمد اعظم نے ان دونوں کو بمقام احمد آباد کچھ مدت قید میں رکھا اور اس بات سے باز آنے کے وعدہ پر انھیں رہا کر دیا مگر قید سے رہا ہونے کے بعد یہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو انھیں دوبارہ قید کر کے دہلی بھیج دیا گیا ایسا ہی دوسرا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خان جی نامی ایک بوہرہ اپنے بارہ مشنریوں کے ساتھ شیعیت کا پرچار کرتا تھا۔ اس نے اس کام کے لئے ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ بھی جمع کیا تھا اسے بھی اورنگ زیب کے حکم سے قید کر کے دہلی پہنچا دیا گیا تھا۔ بوہروں کے ان پڑھ بچوں کو سنی طریقہ کی تعلیم دینے کا بھی خاص انتظام کیا گیا تھا۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں یہاں ایک واقعہ ایسا پایا جاتا ہے کہ مذہبی اسباب کی بنا پر ایک فرقہ کے لوگوں نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لئے حکومت کا سامنا کیا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے اس فرقہ کے مذہبی عقائد کا مختصر تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی میں ایک امام شاہ نامی بزرگ ایران سے گجرات میں وارد ہوئے۔ ان کی کچھ کرامات دیکھ کر ہندو قوم کے کنبی فرقہ کے لوگ امام شاہ کے بڑے معتقد ہو گئے۔ انھوں نے گجرات میں بمقام پیرانہ احمد آباد سے بارہ میل کے فاصلہ پر سکونت اختیار کی اور تبلیغ اسلام کے بڑے انوکھے طریقے اختیار کئے۔ اس فرقہ کے لوگ پہلے مخفی طور پر مسلمان ہو جاتے ہیں اور ایک مدت خاص کے بعد اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اس تقریب کو 'پرگٹ' ہونا کہتے ہیں۔ ان میں ایک خلیفہ ہوتا ہے اسے 'کاکا' کہتے ہیں۔ یہ لوگ نہ مسلمان ہوتے ہیں نہ ہندو۔ دونوں مذاہب کے طریقوں پر کاربند رہتے ہیں۔ یہ لوگ ہولی دیوالی بھی مناتے ہیں اور عید بھی۔ گوشت اور مچھلی نہیں کھاتے اور روزے بھی رکھتے ہیں۔ ان کے وہاں مردوں کو دفن کیا جاتا ہے مگر اس رسم میں کوئی اسلامی طریقہ نہیں ہوتا۔ دفن کرتے وقت گجراتی میں دعائیں پڑھی جاتی ہیں جن میں ہندو اور امام شاہ کے ناموں کے ساتھ برہما، وشنو، اندر کے نام بھی

شامل ہوتے ہیں شادی بیاہ میں اسلامی طریقہ پر عقد خوانی ہونے کے بعد برہمن کو بلا کر ہندو رسم کے مطابق بھی تمام مراحل طے کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ گجراتی قرآن یا امام شاہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ احمد آباد جنوبی گجرات اور کچھ میں پائے جاتے ہیں۔ احمد آباد کے امام شاہی مومنے کہلاتے ہیں اور جنوبی گجرات کے ہندو متیے (مت پر سے) کہلاتے ہیں۔ غرض یہ لوگ دراصل ہندو مگر صوفی مت کے ماننے والے ہیں۔ ان کے تین بڑے مرکز پیرانہ۔ نوساری اور برہان پور ہیں۔

۱۶۹۱ء میں اس فرقہ کے سرگروہ شاہ جی نامی ایک بزرگ تھے جو ان ہی تمام طریقوں پر اپنے معتقدین سے عمل کراتے تھے۔ ممکن ہے اورنگ زیب نے ان ہی باتوں کی روک تھام کرنے کی کوشش کی ہو جس کا نتیجہ شورش تھی۔ اورنگ زیب کو جب اس فرقہ کے اعتقادات اور طریقوں کی خبر ہوئی تو اورنگ زیب نے قاضی احمد آباد کے نام حکم بھیجا کہ شاہ جی کو دہلی روانہ کیا جائے تاکہ ان سے پیغام اسلام کے متعلق مفصل گفتگو کا موقع ملے۔ جب قاضی شہر نے شاہ جی کو بلوایا تو شاہ جی نہ گئے آخر شجاعت خاں کی مدد سے شاہ جی کو بلوایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جی نے شجاعت خاں سے ملاقات کے بعد زہر کھا لیا تاکہ دہلی جانے سے نجات پائیں۔ مگر شاہ جی قید حیات سے نجات پا گئے تو شاہ جی کے مریدوں نے یہ خیال کیا کہ شجاعت خاں نے ان کے مرشد کو زہر دے دیا۔ یہ خبر پھیلتے ہی جنوبی گجرات کے متیے تعصب کے جوش میں اپنے مرشد کے لیے جان دینے کے خیال سے نربدا عبور کر کے شہر بھروچ میں گھس آئے اور قلعہ پر بھی قابض ہو گئے۔ بھروچ کے فوجدار نے ہر چند اس شورش کو فرو کرنے کی کوشش کی مگر لاحاصل ثابت ہوئی آخر شجاعت خاں نے احمد آباد سے فوج روانہ کی۔ چونکہ متیوں میں صرف فرقہ دارانہ بحران پھیلا ہوا تھا قلعہ کے دروازہ کھول دیئے اور ایک طرف فوج کے مقابلہ میں لڑتے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے فرقہ کے لوگوں کو بھی تہہ تیغ کرتے چلے جاتے اور اس طرح اپنے مرشد پر ہزاروں جانیں قربان کر دیں۔

آفات سماوی :-

اس دور میں گجرات کو تین چار سخت ترین آفات ارضی و سماوی کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ۱۶۶۴ء میں شیوا جی کی لوٹ کھسوٹ کے بعد ابھی حواس بحال نہ ہوئے تھے کہ تمام گجرات میں قحط پڑا۔ اس قحط کا بیان ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاغذات سے ملتا ہے۔ گجرات کی اقتصادی حالت پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ ابھی قحط کے شکنجے سے نجات نہیں پائی تھی کہ وبا پھیلی۔ یہ ایک قسم کا بخار تھا۔ اس سے دیہاتوں اور شہروں میں بہت جانی نقصان ہوا۔ کمپنی کی یادداشتیں بتاتی ہیں کہ سورت کی کوٹھی میں بھی اکثریت اس کا شکار ہوئی۔ پارسی اور بنیا قوم کو بھی اس وبا سے کافی نقصان ہوا۔

۱۶۸۱ء سے ۱۶۹۶ء تک گجرات میں چھ قحط پڑے۔ ۱۶۸۱ء میں قحط کی وجہ سے غلہ اتنا گراں ہو گیا کہ ایک عید کے موقع پر گجرات کے صوبہ دار محمد امین بن میر جملہ پر عید گاہ سے لوٹتے وقت لوگوں نے حملہ کر دیا اور یہ بدقت تمام قلعہ میں پہنچا۔ ۱۶۸۴ء میں سابرمتی ندی میں سیلاب آیا اور پانی اتنا چڑھا کہ شہر پناہ کو بہت نقصان ہوا اور پانی شہر میں گھس آیا۔ ۱۶۸۵ء میں بارش کی کثرت سے فصلیں خراب ہو گئیں اور غلہ گراں ہو گیا۔ صوبہ دار نے یہ صورت حال دیکھ کر اورنگ زیب سے غلہ کا محصول معاف کرا لیا اور اس کے بعد تین چار سال یہ محصول وصول نہیں کیا گیا۔ ۱۶۸۶ء میں زیادہ بارش ہونے سے قحط پڑا۔ ۱۶۹۰ء میں سورت، بھروچ احمد آباد اور گجرات کے دوسرے حصوں میں دوبارہ وبا پھیلی۔ ۱۶۹۴ء میں جب غلہ بہت گراں بکنے لگا اور غربا کے لئے بھوکوں مرنے کا وقت آیا تو شجاعت خاں غلہ پر کنٹرول لایا تاکہ غلہ کے بھاؤ کسی طرح بڑھنے نہ پائیں۔ ۱۶۹۶ء میں سب سے زیادہ سخت قحط پڑا۔ مورخوں کا بیان ہے کہ جودھپور سے پٹن گجرات تک پانی اور گھاس نظر نہ آتے تھے۔

صنعت و حرفت :-

گجرات سلاطین کے زمانہ ہی سے صنعت و حرفت اور تجارت

کے لئے آپ اپنی نظیر ثابت ہو چکا تھا۔ سلاطین گجرات نے جس طرح ملک کی زراعت، باغبانی، علوم
فنون وغیرہ کی طرف پوری توجہ دی تھی، اسی طرح یہاں کی صنعت و حرفت کو بھی بام ترقی پر لے جانے میں
کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ بیش قیمت کپڑا، عمدہ کاغذ، صندل کی لکڑی پر ہاتھی دانت کا کام زری
کارچوب وغیرہ گجرات کی خاص صنعتیں تھیں۔ مغلوں نے اپنے تسلط کے بعد بھی ان صنعتوں میں
کافی دلچسپی لی اور بہت کشادہ دلی سے اس کی سرپرستی کی۔

شاہی سرپرستی میں بمقام احمد آباد بڑے بڑے کارخانے قائم تھے۔ شاہجہاں نے اپنی
صوبے داری کے زمانہ میں احمد آباد میں ایک کارخانہ قائم کیا تھا۔ اس کارخانے میں دس لاکھ روپیہ
کی لاگت سے ایک تخت مرصع تیار کرایا گیا تھا۔ ۱۶۳۴ء میں قلعۂ معلی اور تخت طاؤس تیار ہو نے
پر جو دربار منعقد ہوا تھا اس کے لئے احمد آباد میں ایک لاکھ روپیہ کی لاگت سے ایک تخت مرصع تیار کرایا
گیا تھا۔ اورنگ زیب نے بھی گجرات کی صنعتوں کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا۔ اورنگ زیب شہزادہ محمد اعظم
کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ گجرات زیب و زینت ہندوستان ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ گجرات کی بنی
ہوئی اشیاء نہایت مضبوط، زرق برق اور قیمتی ہوتی ہیں۔ اورنگ زیب کو گجرات کے کھانوں میں بھی
ایک کھانا بہت مرغوب تھا۔ اسی شہزادہ کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ "مزہ کھچڑی و بریانی ما یاد می آید"

یہاں کا کاغذ اتنا نفیس اور اچھا تیار ہوتا تھا کہ اس صنعت میں کشمیر پر بھی گجرات کو سبقت
سبقت لے گیا۔ اسی طرح طاس، کمخواب، سوسی۔ الائچہ بھی یہاں نہایت اچھا تیار ہوتا تھا۔ زری
اور کارچوب کے کام کے لئے آج بھی شہر سورت مشہور ہے۔ اس شہر سے ہر سال کئی کروڑ روپیہ
کا مال تیار ہو کر دیس پردیس جاتا ہے۔ آج بھی سوتی کپڑے کے لئے احمد آباد کو ہندوستان کا مانچسٹر
کہتے ہیں۔ صندل اور ہاتھی دانت کی اشیاء بھی نہایت اچھی تیار کی جاتی تھیں شاہ عالم کے دورِ
حکومت میں بھی شاہی ضروریات کے لئے احمد آباد میں چھپن ہزار کی لاگت سے چار قیمتی شامیانے

تیار کرائے گئے تھے۔ یہاں کے کاریگر اتنے اچھے اور اپنے فن میں ایسے یکتا تھے کہ راجہ جے سنگھ نے محمد شاہ کے عہد میں جب جے پور آباد کیا تو احمد آباد سے انعام و اکرام کا لالچ دے کر کاریگروں کو جے پور لے جایا گیا تھا۔

علما: سرزمین گجرات نے ہر زمانہ میں بڑے بڑے علما پیدا کئے ہیں۔ یہاں اس دور سے متعلق چند علماء کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا احمد کردی گجرات کے علما میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ تمام عمر درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ فن کلام میں فیوض القدس مولانا کی قابل ذکر تصنیف ہے۔ سنہ ۹۸۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ دوسرے بزرگ سید محمد بن جعفر حسینی رضوی ہیں انھیں مخدوم جہانیاں کی اولاد میں سے ہونے کا شرف حاصل تھا۔ ان بزرگ کی بھی تمام عمر علمی مشاغل میں گذری۔ قرآن شریف کی دو تفسیریں اور زینتہ النکاۃ فی شرح المشکوٰۃ ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔ سنہ ۱۰۱۱ھ میں انتقال کیا۔ شیخ جمال الدین چشتی بھی بڑے عالم اور مصنف گذرے ہیں۔ بے شمار کتابوں پر انھوں نے شرحیں لکھی ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو بیالیس بیان کی جاتی ہے۔ سنہ ۱۰۴۲ھ میں وفات پائی۔ گجرات کے سب سے بڑے عالم مولانا شیخ نورالدین صدیقی سہروردی تھے۔ مولانا کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے۔ سید علی ابن سید جلال بن سید محمد رضوی شاہ عالم بخاری کی اولاد میں سے تھے۔ انھیں شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ میں بڑے بڑے منصب عطا ہوئے تھے۔ سنہ ۱۰۶۲ھ میں انھیں شاہی کتب خانہ کا داروغہ بھی مقرر کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۰۷۰ھ میں جب شاہی خدمات سے مستعفی ہو گئے تو اورنگ زیب نے بارہ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ سنہ ۱۰۷۳ھ میں دوبارہ منصب و خلعت عطا کئے گئے۔ سنہ ۱۰۹۱ھ میں وفات پائی۔

یہاں عالمگیری دور کے چند قاضیوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے اس دور کے سب سے زیادہ با اقتدار قاضی قاضی عبدالوہاب گذرے ہیں۔ اورنگ زیب اپنی صوبہ داری گجرات کے

زمانہ سے قاضی صاحب موصوف سے بہت مرعوب تھا۔ قاضی صاحب نے ۱۰۸۶ھ میں انتقال کیا۔ قاضی شیخ السلام قاضی عبدالوہاب کے بیٹے اپنے والد کے بعد قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ نہایت متقی و پرہیزگار تھے۔ انھوں نے اپنے والد کی دولت اور اثاث البیت میں سے ایک حبہ نہیں لیا۔ ۱۰۹۴ھ میں اپنے عہدہ سے مستعفی ہوکر حج بیت اللہ کو چلے گئے یہ نہایت راستباز اور صاف گو تھے۔ ۱۱۰۹ھ میں وفات پائی۔ قاضی عبدالوہاب کے داماد قاضی ابوسعید ۱۰۸۶ھ میں دہلی کے قاضی مقرر ہوئے تھے۔ ۱۰۹۴ھ میں انھیں گجرات میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ ۱۰۹۹ھ میں وفات پائی۔ قاضی عبداللہ قاضی ابوسعید کے بعد قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آخر وقت میں انھیں صدرالصدوری کی خدمت پر مامور کیا گیا تھا ۱۱۰۹ھ میں وفات پائی۔ قاضی عبدالحمید بن قاضی عبداللہ اس دور میں صوبۂ گجرات کے دیوان، سورت کے متصدی اور زمانۂ فرخ سیر میں خدمت شاہی پر فائز رہے۔ قاضی اکرم الدین قاضی عبدالوہاب کے پوتے تھے۔ انھیں شاہ عالم نے شیخ الاسلام کا خطاب عنایت کیا تھا۔ اکرم الدین نے اپنے استاد و مرشد مولانا نورالدین کے لئے احمد آباد میں ۱۱۱۱ھ میں ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ ان بزرگوں کے علاوہ شریعت خاں بن قاضی عبداللہ، متشرع خاں بن قاضی شریعت خاں، نورالحق بن قاضی عبدالوہاب اور عبدالوہاب کے فرزند نورالحق اور عبدالحق بھی گجرات کے علماء و فضلاء میں قابل ذکر ہیں۔

مدارس :-

سلاطین گجرات کے زمانہ کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ان تاجداروں نے علوم و فنون کی سرپرستی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی مگر گجرات پر مغلوں کا تسلط ہوجانے کے بعد بھی گجرات علوم و فنون کا ایک مرکز رہا۔ احمد آباد اپنے مدارس کے لئے مشہور تھا۔ یہاں بڑے بڑے علماء کا اجتماع رہا ہے جن کے متعلق عرض کیا جاچکا ہے۔ چوں کہ اورنگ زیب خود بہت علم دوست بادشاہ گذرا ہے

اس لئے علوم کی اس زمانہ میں بڑی قدر و منزلت تھی اس کا بڑا ثبوت گجرات کے بلند پایہ مدارس ہیں۔ یہاں گجرات کے چند مدارس کا ذکر کیا جاتا ہے جو چراغ علم و ہدایت منور کئے ہوئے تھے اور صدہا طالبان علم ان چشمہائے فیض سے سیراب ہوتے رہے۔

احمد آباد میں علامہ شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی متوفی ۹۹۸ھ کا مدرسہ قابل ذکر ہے۔ اس مدرسہ میں تقریباً پچپن سال علامہ موصوف نے درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ علامہ کے بعد آپ کے فرزند مولانا عبداللہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ مولانا عبداللہ کے بعد علامہ کے پوتے نے بھی روایات ماضی کو زندہ رکھا۔ اس مدرسہ میں طلبا کے لئے دارالاقامت بھی تھا۔ آج بھی اس عمارت کے حجرے بوسیدہ حالت میں اپنی دیرینہ شان و شوکت کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ مدرسہ محلہ خان پور میں واقع ہے اسی جگہ علامہ آسودۂ خاک ہیں۔ احمد آباد میں قلعہ کے مقابل ایک امیر سیف خاں نے بھی ۱۰۳۲ھ میں مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔

احمد آباد کا سب سے مشہور و معروف مدرسہ مدرسہ ہدایت بخش ہے۔ یہ مدرسہ مولانا شیخ نورالدین صدیقی سہروردی کے ایک شاگرد و عقیدت مند نواب اکرم الدین نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیہ کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا۔ اس مدرسہ کا سنگ بنیاد ۱۱۱۰ھ میں رکھا گیا اور ۱۱۱۲ھ میں یہ عمارت تکمیل کو پہنچی۔ اس وقت بھی اس مدرسہ اور مسجد کے آثار محلہ آسٹوریا میں ہماری عبرت کے لئے موجود ہیں۔ مدرسہ کے اخراجات کے لئے نواب موصوف نے کئی دیہات وقف کر دیئے تھے۔ ۱۱۵۵ھ تک مولانا اس مدرسہ میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ ولی نے اسی مدرسہ کی تعریف میں ایک رسالہ نورالمعرفت لکھا ہے۔ احمد آباد کے مقبول عام صوبہ دار شجاعت خاں نے اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں بہت عالی شان مدرسہ بنوایا تھا۔ اس وقت بھی یہ مدرسہ بہت اچھی حالت میں موجود ہے اور یتیم خانہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

شہر سورت میں بھی اس زمانہ میں دو بڑے مدرسے علم و دین کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ بعہد ... یادگار، بنا ر سید محمد بن سید عبداللہ العیدروس کے مزار کے متصل حاجی زاہد بیگ نے ۱۰۴۱ھ میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ اس مدرسہ میں اسی برگزیدہ خاندان کے چند افراد عرصہ تک درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ نواب ظفر یاب خاں نے بھی مرجان شامی کی مسجد سے متصل ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ جو اس دور میں طالبان علم کی ضروریات کو پورا کرتا رہا۔

اردو ادب :-

اردو کی ابتدائی نشو و نما سلاطین گجرات کے آخری دور میں ہوئی مگر جب ان کی حکومت ختم ہو گئی تو اس کی یہ خوش قسمتی تھی کہ تاجدار دکن نے اردو کی سرپرستی کا بیڑا اٹھایا اس طرح اردو کی ترقی و تربیت میں فرق نہ آنے پایا اور اس کو اپنے ارتقائی مدارج طے کرنے کا زریں موقع مل گیا۔ اس وقت اردو ادب کے جس دور کا جائزہ مقصود ہے وہ ادب کا دوسرا دور ہے۔ اس دور میں شاعری کی تقریباً ہر صنف نے کافی ترقی کی۔ اس دور کے ادبی کارناموں کا سرسری بیان یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بیجاپور کا فرمانروا علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) بڑا صاحب ذوق تھا۔ اس نے اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ رکھا اور اردو کی سرپرستی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ اس عہد کا قابل قدر شاعر نصرتی ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی کا بیان ہے کہ اورنگ زیب نے فتح بیجاپور کے بعد اسے ملک الشعرا بنا دیا تھا۔ اس سے دو مثنویاں یادگار ہیں ایک بزمیہ مثنوی گلشن عشق اور دوسری رزمیہ مثنوی علی نامہ ہے۔ علی نامہ شیواجی اور سلطان کے درمیان کی معرکۃ الآراء جنگ کا احوال ہے نصرتی قصیدہ گوئی کے لئے بھی مشہور ہے اس زمانہ کی زبان کو دیکھتے ہوئے اس کے قصائد آپ اپنی نظیر ہیں۔ اس دور کا ایک شاعر ملک خوشنود اپنی مذہبی مثنوی احکام الصلوٰۃ کی وجہ سے مشہور ہے شمس العشاق شاہ میراں جی کے پوتے امین الدین اعلیٰ بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اعلیٰ نے سلوک و معرفت میں نظم

وجود یہ رموز السالکین اور نظم قبریہ لکھی۔ بیجاپور کا آخری تاجدار سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ھ تا
۱۰۹۷ھ) گذرا ہے۔ اگرچہ اس کے قلیل عہد حکومت میں خانہ جنگیوں کی وجہ سے نظام حکومت درہم
برہم ہو گیا تھا اور ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی تاہم علم و ادب کا بازار سرد نہ ہونے پایا تھا۔ اس عہد
کے نامور شعرا میں سیوا کا نام ملتا ہے۔ اس نے روضۃ الشہدا کو اردو کا جامہ پہنایا۔ شاعر مومن
نے اس دور میں سید محمد جون پوری کے حالات کو منظوم کیا اور اس کا نام اسرار عشق رکھا۔ بیجاپور
کا آخری اور قابل ذکر شاعر ہاشمی ہے یہ مادر زاد نابینا تھا۔ اس کی مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور ہے۔

بیجاپور کی طرح گولکنڈہ کے حکمرانوں نے بھی اردو کی ترقی و توسیع میں بہت دلچسپی لی۔
عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کا عہد حکومت اردو کے لئے بہت مبارک گذرا
ہے۔ اس عہد میں دکن میں بہت بلند پایہ شاعر گذرے ہیں جنھوں نے شاعری کے معیار کو آسمان
پر پہنچا دیا تھا اس سلطنت کے تین فرماں روا ریختہ کے دلدادہ تھے عبداللہ اور اس کے دو پیش رو
سلطان صاحب دیوان گذرے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ریختہ کو خود شاہان وقت نے پسند کیا اور
اس میں طبع آزمائی بھی کی لیکن ان کے دور میں ریختہ نے کوئی قابل ذکر فروغ حاصل نہیں کیا
بلکہ مثنوی ہی کا طوطی بولتا تھا اور جتنے بڑے شاعر گذرے ہیں انھوں نے مثنوی ہی میں اپنے کمال فن
کا ثبوت دیا ہے۔ بظاہر اس کے اسباب یہ معلوم ہوتے ہیں کہ مثنوی میں باکمالوں کو اپنی صلاحیتوں اور
قادر الکلامی کے اظہار کا بہت موقع ملتا ہے۔ دوسرے ریختہ اور اس کی زبان میں وہ تازگی اور توانائی پیدا
نہیں ہوئی تھی جو اس کی مقبولیت کا سبب بنتی۔ اسے کسی مصلح و مجتہد کی ضرورت تھی جس ضرورت
کو بعد میں ولی نے پورا کیا۔ اس دور کے دو نامور شاعر غواصی اور ابن نشاطی ہیں۔ غواصی نے
۱۰۳۵ھ میں مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال لکھی اور ابن نشاطی نے مثنوی پھول بن (۱۰۷۶ھ)
اور طوطی نامہ یادگار چھوڑی ہیں۔ پھول بن نہایت مرصع مثنوی ہے اس میں شاعر نے اپنے کمال فن کا

بہترین ثبوت دیا ہے۔ ۱۰۶۴ھ میں ایک شاعر جنیدی نے قصۂ ابوشحمہ نظم کیا۔ اس شاعر کی ایک مثنوی ماہ پیکر بھی مشہور ہے عبداللہ کے آخری دور کے شعرا میں طبعی قابل ذکر ہے اس نے ۱۰۸۱ھ میں ایک بزمیہ مثنوی بہرام و گل اندام لکھی۔ اس سلطنت کا آخری تاجدار ابوالحسن (۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷ھ) تھا اس عہد کے ایک شاعر فائز نے ۱۰۹۴ھ میں ایک مذہبی مثنوی قصۂ رضوان شاہ و روح افزا یادگار چھوڑی ہے۔ اسی دور کا ایک شاعر لطیف ہے۔ لطیف نے ۱۰۹۵ھ میں مذہبی مثنوی ظفر نامہ لکھی۔

۱۰۹۷ھ سے دکن میں مغلیہ دور شروع ہوا۔ اگرچہ مغلوں کے تسلط کے بعد اردو کی سرپرستی کو بڑا دھکا پہنچا۔ شعرا نے روز بد دیکھا اردو کے شاعروں کی قدر و منزلت کم ہو گئی۔ فارسی کا دور شروع ہوا تاہم اردو کے چند اعلیٰ پایے کے مثنوی نگار اس دور میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس دور میں ایک فرق یہ پایا جاتا ہے کہ شعرا نے درباروں کی بے رونقی اور سرپرستی کے فقدان کی وجہ سے بزمیہ مثنویاں لکھنا ترک کر دیا اور چوں کہ یہ دور نشۂ عیش و عشرت کے خمار کا دور تھا۔ اس لئے شعرا اپنی اس سیاہ بختی کو اپنے اعمال کی پاداش سمجھ کر نجات کے طالب ہوئے اور اس کے لئے مذہبی مثنویوں کو آلۂ کار بنایا اور اپنے پریشان دل و دماغ کو اس طریقہ پر تسکین دینا چاہا۔

اس دور میں تقریباً تمام مذہبی مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ مغلیہ دور کا بڑا شاعر ولی ویلوری گذرا ہے۔ اس کی روضۃ الشہدا (۱۱۱۹ھ) مشہور ہے۔ اس مثنوی کے لئے ایک عرصہ تک مغالطہ رہا اور ولی گجراتی سے منسوب کی جاتی تھی اور سنہ تصنیف ۱۱۴۳ھ بیان کیا جاتا تھا اس دور میں محمود بحری نے ایک متصوفانہ مثنوی من لگن ۱۱۱۱ھ میں لکھی۔ عشرتی بھی اسی دور سے تعلق رکھتا ہے اس نے تصوف میں دو مثنویاں چیت لگن اور دیپک پتنگ یادگار چھوڑیں۔ شاعر ضعیفی کی مذہبی مثنوی ہدایت ہندی مشہور ہے۔ حسین ذوقی نے سب رس کے قصہ کو منظوم کیا اور وصال العاشقین اس کا نام رکھا۔ اسی شاعر کی

دوسری مثنوی غوث اعظم کی منقبت ہے۔ اس دور کے شاعر مجرمی نے ۱۱۴۷ھ میں سب رس کو منظوم کیا اس کا نام گلشن حسن و دل ہے۔

گجرات عہد اکبر سے مغلیہ حکومت کے زیر نگیں تھا۔ اردو کو اس جگہ کوئی سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ اردو کی خدمت یا تو صوفیا اور مشائخ نے انجام دی یا صوفی مشرب شعرا نے مذہبی مثنویاں لکھ کر اردو کی ترقی میں حصہ لیا۔ دکن کی طرح یہاں امیروں کے درباروں میں اس کا گذر نہیں تھا اس لئے گجرات میں اچھے مثنوی نگار پیدا نہیں ہوئے یہی وجہ ہے کہ یہاں بزمیہ اور رزمیہ مثنویاں نہیں پائی جاتیں اور جو ایک دو ملتی ہیں وہ ادبی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اسی دور میں اس کے بعد تیرھویں ص۔ ہ کے وسط تک یہاں مذہبی مثنویاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ گجرات کے مثنوی نگاروں میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

مسکین ایک شاعر گذرا ہے جس نے سنہ ۱۰۹۲ھ میں چند مذہبی مثنویاں لکھی ہیں ان میں جنگ نامۂ محمد حنیف مشہور رہے۔ اس موضوع پر دکن میں بھی مثنویاں لکھی گئی ہیں یہ موضوع اتنا مقبول تھا کہ پنجابی زبان میں بھی اس پر مثنویاں دستیاب ہوتی ہیں۔ اس دور میں گودھرہ کے دو نامور شاعر محمد امین اور محمد فتح گذرے ہیں۔ محمد امین نے ۱۱۰۹ھ میں یوسف زلیخا لکھی یہ ہاشمی کا ہمعصر تھا۔ ان دونوں کی ایک ہی موضوع پر مثنویوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ امین کی ایک مثنوی تولد نامہ (مع معراج نامہ اور وفات نامہ) پائی جاتی ہے۔ امین کے ہمعصر اور ہم وطن محمد فتح نے ایک مذہبی مثنوی یوسف ثانی یادگار چھوڑی ہے۔ مثنوی کا موضوع چند فقہ کے مسائل ہیں جنھیں ایک فرضی قصہ میں چسپاں کیا گیا ہے۔ اس ڈھنگ کی مثنویاں دکن میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے معلوم ہوتا ہے یہ طریقہ بہت موثر ثابت ہوا تھا۔ اس دور کے ایک قابل ذکر صوفی شاعر پیر مشائخ (۱۱۳۰ھ تا ۱۲۱۱ھ) ہیں۔ پیر صاحب نے مذہب اسلام کی تبلیغ اور اسلامی عقائد کو اپنے حلقۂ عقیدت مند ان

میں پھیلانے کی غرض سے کافی تعداد میں چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں لکھیں اس دور کے بعد بھی یہاں بے شمار مذہبی مثنویاں لکھی گئیں۔

الغرض گجرات اور دکن کے ادب کے جائزہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں مثنوی کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ شاہانِ دکن کی سرپرستی کی وجہ سے بزمیہ اور رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں۔ امیروں کی دربارداری کی وجہ سے دکن میں قصائد بھی پائے جاتے ہیں۔ تاجدارانِ بیجاپور کے ذوقِ حسن و عشق کی وجہ سے صنفِ غزل میں بھی اچھی آبیاری کی گئی۔ صوفیائے کرام نے مذہب کے پھیلانے کی غرض سے مذہبی مثنویاں لکھیں ان کے تتبع میں غیر صوفیوں نے بھی اس طرز کو اختیار کیا۔ شہدائے کربلا کے پرستاروں نے مرثیے لکھے اور اس طرح ادب کا کافی ذخیرہ اس وقت تک جمع ہو گیا۔ اس ادب کو دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ طرزِ تخیل ہندی تھا۔ اگرچہ زبان میں کافی وسعت پیدا ہو چکی تھی تاہم محتاجِ اصلاح معلوم ہوتی ہے۔ دکن میں بہترین شاعر پیدا ہوئے نثرنگاروں نے بھی خدمت انجام دی مگر کوئی مصلح پیدا نہ ہوا جو زبان و ادب کا رخ بدل دیتا۔ یہ چیز ہمارے شاعر ولی کے حصہ میں آئی تھی۔

سوانح حیات

نام اور نسب :۔ جس طرح ولی کے وطن کے بارے میں محققین کی رائیں مختلف ہیں اسی طرح ولی کا صحیح نام بھی اہل علم کے لئے ایک معما بن گیا ہے۔ تذکرہ نویسوں کے یہاں شاعر کے نام کی مختلف صورتیں ولی اللہ، شمس ولی اللہ، محمد ولی، ولی محمد پائی جاتی ہیں۔ میر حسن، میرزا لطف علی اور عبد الغفور نساخ نے ولی اللہ لکھا ہے، آزاد اور نواب علی ابراہیم خاں شمس ولی اللہ لکھتے ہیں۔ فتح علی گردیزی، شفیق اورنگ آبادی، ثناء اللہ فانی اسے ولی محمد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان تذکرہ نویسوں کے بیانات کے علاوہ احمد آباد کے مشہور عالم اور بزرگ شاہ وجیہ الدین کے خاندان کے ایک ممتاز رکن جناب سید منظور حسین علوی المعروف بہ حسینی پیر صاحب ایسی چند دستاویز فراہم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن پر ولی اور خاندان کے دوسرے ارکان کے دستخط ثبت ہیں مثلاً شاہ وجیہ الدین کے خاندان کے ایک اہم محضر پر ولی کی یہ مہر پائی جاتی ہے:۔

(۱) "خاک نعلین غوثی محمد ولی اللہ بن شریف محمد علوی"

پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے پاس ۱۱۱۵ھ کا ایک تمسک نامہ ہے جس میں بہ حیثیت گواہ ولی اور اس کے دو بیٹوں کے دستخط ہیں۔ ولی نے گواہ کی حیثیت سے یہ عبارت لکھی ہے :۔

(۲) "مضمون تمن سید لطف اللہ اقرار نمودند۔ حررہٗ محمد ولی اللہ بن شریف محمد العلوی"۔

بیٹوں کے دستخط یہ ہیں :۔

(۳) "قد اطلع علی ذالک الفقیر الی اللہ الغنی احمد ولی اللہ بن محمد شریف العلوی"

(۴) "من المطلعین محمد مجتبیٰ ابن ولی اللہ العلوی"

(۵) "امجد بن محمد ولی اللہ العلوی"

ولی کے ہم جد حضرت سید عبد الملاک نے ملفوظ کبیری مولفہ ۱۰۴۵ھ تا ۱۰۶۰ھ میں شریف محمد (ولی کے والد) کی اولاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"از محمد شریف چار پسر۔ میاں عبد الرحمٰن و میاں حبیب اللہ و میاں خلیل اللہ و میاں ولی اللہ و دو دختر" ولی شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی قدس سرہٗ کے بھائی شاہ نصر اللہ کی اولاد سے تھا۔ اس کا سلسلۂ نسب یہ ہے[۱]:۔

شاہ ولی اللہ بن شریف محمد متوفی ۱۰۷۳ھ بن سید عبد الرحمٰن بن سید احمد متوفی ۱۰۰۸ھ

---

[۱] شیخ وجیہ الدین احمد العلوی:۔ سلاطین گجرات کے دورِ عظمت میں آپ کے اجداد ہندوستان میں وارد ہوئے، محمد آباد عرف چاپانیر میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ کے بزرگوں کی سلاطین گجرات نے بڑی قدر و منزلت کی، علامہ وجیہ الدین قدس سرہٗ محرم ۹۱۰ھ میں محمد آباد میں پیدا ہوئے، ۵ سال کی عمر سے ۳۲ سال کی عمر تک حصول علم میں منہمک رہے۔ اور اس کے بعد آخر عمر تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہزارہا طالبانِ علم نے آپ سے اکتسابِ علم کیا۔ آپ نے بہت سی درسی کتابوں کی شرحیں اور حواشی لکھے، علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی میں بھی آپ مرتبۂ کمال تک پہنچے۔ اگرچہ قاذن شطاری سے آپ کو ارادت تھی لیکن تصوف کے مراحل شیخ محمد غوث نے طے کرائے تھے۔ راہ تصوف میں آپ انھیں کے پیرو تھے۔ ۸۸ سال کی عمر میں ۹۹۸ھ میں بمقام احمد آباد انتقال فرمایا۔ محلہ خان پور میں جس جگہ آپ درس و تدریس میں مشغول رہا کرتے وہی آپ کی آخری آرام گاہ قرار پائی، آپ کے مرید خاص صادق خاں نے آپ کا مقبرہ تعمیر کرایا اور ایک مدرسہ قائم کیا۔ اسی مدرسہ کے ساتھ دار الاقامہ بھی تھا جہاں دور دراز سے طلبا آتے اور قیام کرتے آپ کی اولاد نے بھی آپ کی سنت کو قائم رکھا اور علم کے چراغ کو روشن رکھا جس سے ہزارہا افراد مستفید ہوتے رہے۔ صفحہ ۶۸-۶۹-۷۰ مراۃ احمدی خاتمہ) اس خاندان کے بے شمار افراد سورت، خاندیس، برہان پور اور دکن میں جا کر آباد ہو گئے۔ موجودہ زمانہ میں بھی آپ کے خاندان کے لوگوں سے قریب قریب ایک محلہ آباد ہے[۲] نسب نامہ ملاوکہ حسینی پیر صاحب۔

بن سید بہاؤ الدین بن حضرت شاہ نصر اللہ حسینی (برادر حقیقی حضرت قطب العارفین علامہ شاہ وجیہ الدین رحمتہ اللہ علیہ)

ان اسناد کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ خود ولی اپنا نام محمد ولی اللہ لکھتا ہے جیسا کہ م۱ اور م۵ سے ظاہر ہے م۳ اور م۴ میں اس کے بیٹوں نے ولی اللہ لکھا ہے اسی طرح م۲ اور م۳ میں ولی کے والد کا نام شریف محمد اور محمد شریف پایا جاتا ہے۔ عبد الملک نے ملفوظ کبیری میں ولی اللہ اور والد کا نام محمد شریف لکھا اور نسب نامہ میں شاہ ولی اللہ پایا جاتا ہے۔ علامہ وجیہ الدین کے خاندان کے اکثر ناموں کے ساتھ "شاہ" کا لفظ آتا ہے جیسے شاہ وجیہ الدین، شاہ محمد (پسر شاہ وجیہ الدین) شاہ نصر اللہ برادر شاہ وجیہ الدین۔ غالباً اسی وجہ سے نسب نامہ میں ولی کے پہلے شاہ کا لفظ موجود ہے۔ الغرض ولی کے خود اپنے بیان کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا پورا نام محمد ولی اللہ ہوگا۔ عبد الملک نے ملفوظات کبیری میں ولی کا نام آخر میں لکھا ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ولی اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوگا۔

وطن:۔ ولی کے سوانح حیات کے سلسلہ میں سب سے اہم اور دلچسپی کا باعث اس کے وطن کا مسئلہ ہے جس پر دورِ حاضر کے بعض فضلا نے تحقیق و نکتہ آفرینی کی داد دی ہے۔ ان اہل علم میں ایک بہت بڑی اکثریت دکھنی حضرات کی ہے جنھوں نے ولی کے متعلق اپنی تحقیقات سے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ان حضرات نے ولی کے دکھنی ہونے کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ ملک کے بعض نامور محققین نے اس دعوے کی صحت کو تسلیم کر لیا اور اصل حقیقت جاننے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ۱۹۳۷ء میں مملکت آصفیہ میں ولی کی دو صد سالہ برسی کے جشن کے موقع پر نہایت واضح اور تحدی آمیز انداز میں یہ اعلان کیا گیا کہ

> اُس کے بعد گجرات کا کوئی قدردانِ ولی خواہ وہ تذکرۂ شعرائے گجرات کا مولف ہو یا کوئی اور محبِ گجرات ولی کو گجراتی کہنے کی جرأت

نہیں کر سکتا"[۵۱]

ولی کی وطنیت سے متعلق دکن کے اہل علم نے جو کچھ لکھا ہے اسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے اسے دکھنی ثابت کرنے میں محض قیاس آرائی سے کام لیا گیا ہے اور اس کے گجرات سے تعلقات اور وابستگیوں کے شواہد کو کماحقہٗ اہمیت نہیں دی گئی اور نہ ہی قدیم تذکروں کے بیانات کے پیش نظر علامہ وجیہ الدین کے خاندان کے ارکان سے صحیح حالات معلوم کرنے کی زحمت گوارا کی گئی۔

تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ ولی کو علامہ وجیہ الدین کے خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا تاہم ولی کے دکھنی ثابت کرنے کے لئے جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں بھی ولی دکھنی نہیں ٹھہرتا بلکہ اس کے گجراتی ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ وطنیت کے سلسلہ میں جو چیزیں مفید مطلب ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ تذکرہ نویسوں کے بیانات
۲۔ ولی کے چند اشعار متعلق دکن
۳۔ ولی کے کلام کے قلمی نسخوں پر لکھے ہوئے نام (ولی دکھنی یا متوطن دکن)
۴۔ ولی کا فراق گجرات والا قطعہ
۵۔ ولی کے کلام کا لسانی پہلو
۶۔ ولی کے کلام میں دکھنی معاصرین کا ذکر

جہاں تک تذکروں کا تعلق ہے ولی کی وفات کے ۴۶ سال بعد ولی کا تذکرہ سب سے پہلے خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کی تصنیف گلشن گفتار (۱۱۶۵ھ کی تالیف) میں

---

۵۱ سٹی کالج کا یادگار ولی نمبر ۱۹۳۷ء

ملتا ہے اس کے بعد دوسرے تذکروں میں بھی اس کا ذکر پایا جاتا ہے جن میں بعض نے گجراتی لکھا ہے اور بعض اسے دکن سے منسوب کرتے ہیں ہم یہاں تمام تذکرہ نگاروں کی قلمی شہادتیں پیش کرتے ہیں۔ پہلے ان تذکروں کے بیانات کو ملاحظہ فرمایئے جنھوں نے ولی کو گجراتی لکھا ہے:۔

۱۔ ولی کے قریب العہد آصف جاہی دربار کے گرامی منزلت امیر خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی اپنی تصنیف (۱۱۶۵ھ) میں لکھتے ہیں:۔

"ولی محمد ولی احمد آبادی عجب فکر رسائے داشت و دیوان دلچسپ رنگینے طرح نمودہ اکثر اوقات خود در طلب علم گزرانیدہ در بلدہ دارالسرور برہان پور نیز مدتے سکونت داشت و بجانب میاں سید معالی کہ از مشائخ زادہائے گجرات بودند میل تمام داشت۔ دیوان مشہور و معروف دارد آخر عمر در گجرات وفات نمود۔[۵۱]"

۲۔ شیخ قیام الدین قائم چاندپوری مخزن نکات (۱۱۶۸ھ) میں رقم طراز ہیں:۔

"شاہ ولی اللہ ولی متخلص شاعرے ست مشہور مولدش گجرات است گویند بہ نسبت فرزندی شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ اولیائے مشاہیر است افتخار ہا داشت در سن چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ ہمراہ میر ابوالمعالی نام سید پسرے کہ دلش فریفتہ او بود بجہان آباد آمد۔[۵۲]"

۳۔ نواب ابراہیم خاں اپنی تالیف گلزار ابراہیم ۱۱۹۸ھ میں لکھتے ہیں۔

ولی۔ دکھنی شاہ ولی اللہ۔ اصلش گجرات۔ در شعرائے دکن مشہور و ممتاز ست گویند در زمان عالمگیر بادشاہ بہ ہندوستان آمدہ مستفید از شاہ گلشن گردید۔ از مشاہیر ریختہ گویاں او اول کسے ست کہ دیوانش در دکھن مشتہر و مدون گشتہ۔

۴۔ میر حسن تذکرۂ شعرائے اردو ۱۱۸۸ھ میں لکھتے ہیں

---

۵۱ ص۸ ۵۲ ص۱۰

شاہ ولی اللہ، المتخلص بہ ولی، مشہور و معروف مردے بود از خاک گجرات" ۵۱

۵۔ قاضی سید نور الدین فائق مولف مخزن شعرا ۱۲۶۸ھ فرماتے ہیں :۔

"ولی تخلص محمد ولی نام مولدش احمد آباد و مدفنش ہم ہماں بلدہ خجستہ بنیاد، و مدفنش مابین مزار موسی سہاگ و شاہی باغ اول کسے کہ آئینہ سخن بندی را بہ صیقل گری نظم جلا بخشید و ریختہ را بہ گرمی بلاغت نشانید ہمیں است، دریں باب سرگروہ و مقدمۃ الجیش جمیع شاعران ہند و گجرات ست، بر ضمائر انجم نظائر ناظران ہوشمند مخفی و محتجب نماند کہ محققان ایں فن را در حال او اختلاف است کہ آیا ولی از گجرات است و یا از دکن، اما بہ راقم آثم از زبانی ثقات بلدۂ احمد آباد بہ ثبوت چناں پیوستہ کہ شاعر مزبور از بلدۂ مسطور بودہ و سالہا بدکھن ہم گذرانید" ۵۲

۶۔ عبد الغفور نساخ سخن شعرا ۱۲۸۱ھ میں لکھتے ہیں

شاہ ولی اللہ اولاد میں شاہ وجیہ الدین گجراتی علیہ الرحمۃ کے تھے۔ عالمگیر بادشاہ کے عہد میں دہلی میں آئے تھے بعضے تذکرہ والوں نے ان کا نام ولی محمد لکھا ہے اور ان کو موجد ریختہ جانتے ہیں ۵۳ ..... وغیرہ

۷۔ حافظ سید ممتاز علی بھوپالی آثار الشعرا ۱۳۰۴ھ میں لکھتے ہیں

ولی اللہ احمد آباد گجرات کے باشندے جو شاہ وجیہ الدین کے خاندان سے تھے ابو المعالی کے ساتھ دہلی میں آئے ۵۴

۸۔ آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں۔

ولی احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اور شاہ وجیہ الدین کے مشہور خاندان میں سے تھے ۵۵

---

۵۱ صفحہ ۱۸۴ ۵۲ صفحہ ۱۱ ۵۳ صفحہ ۵۵۶ ۵۴ صفحہ ۲۰ ۵۵ صفحہ ۹۰

ان کے علاوہ منشی قدرت اللہ صدیقی مرادآبادی مرتب طبقات الشعرا ۱۱۸۸ھ ۵۱
شیخ غلام محی الدین قریشی مولف تذکرۂ طبقات سخن ۱۲۲۴ھ ۵۲
شیخ احمد بخش میاں مصنف حدیقۂ احمدی متوفی ۱۲۶۵ھ ۵۳
غلام محمد منظور مرتب دیوان ولی ۱۲۹۰ھ ۵۴ وغیرہ ولی کے گجراتی اور احمدآبادی ہونے میں متفق الرائے ہیں۔

دیوان ولی کے یورپ میں کئی نسخے ہیں ولی کے سلسلہ میں جو صراحت متفرق فہرستوں میں کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

بلوم ہارٹ کے معلومات کا خلاصہ۔

ولی دکھنی جن کا نام شاہ ولی اللہ تھا۔ بعض محمد ولی اور بعض ولی اللہ سے موسوم کرتے ہیں ولی الدین بھی کہا گیا ہے۔ یہ احمدآباد گجرات کے رہنے والے تھے، شاہ وجیہ الدین کے مریدوں میں ان کا شمار ہوتا ہے، ابوالمعالی کے ساتھ اورنگ زیب کے عہد سنہ ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) میں دہلی گئے یہاں سعداللہ گلشن سے ملاقات کی۔ پہلی مرتبہ فارسی کے بجائے ریختہ نظم لکھی ۵۵

(۲) اکسفرڈ کیٹیلاگ۔

"ہندوستان کے ممتاز شاعر شاہ محمد ولی گجراتی ان کا تخلص ولی تھا۔ ۵۶ وغیرہ

(۳) اڈنبرا کی فہرست میں لکھا ہے

"شاہ ولی اللہ گجرات کے باشندے تھے دکھن میں سکونت اختیار کر لی تھی" ۵۷

---

۵۱ بحوالۂ کلیات ولی ضمیمہ نمبر ۲ صفحہ ۸۷ ۵۲ ہندوستانی جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۳۲۵ ۵۳ مملوکہ شیخ امین شیخ بہادر۔ حدیقۂ احمدی تاریخ ہندوستان ہے اس کی تین ضخیم جلدیں ہیں تیسری جلد میں ایک باب عربی فارسی اردو کے شعرا سے متعلق ہے چمن سوم فصل دوم حصہ سوم ۵۴ مطبوعہ ۶-۱۹۰۵ء ۵۵ یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۴۸۳ ۔ ۵۶ صفحہ ۴۸۴ ۵۷ یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۴۸۴

(۴) اسپرنگر کی فہرست۔

"ولی گجراتی ان کے دیوان کے بکثرت نسخے ہندوستان میں پاے جاتے ہیں۔" [۵۱]

اب ان تذکروں کے بیانات ملاحظہ فرمایئے جنھوں نے ولی کے وطن کے لئے لفظ دکن لکھا ہے یا اسے دکنی قرار دیا ہے۔

(۱) فتح علی الحسینی گردیزی کا تذکرہ "تذکرۂ ریختہ گویاں" ولی کے قریب العہد یعنی ۱۱۶۶ھ کی تالیف ہے اس میں یہ الفاظ پاۓ جاتے ہیں۔ "محمد ولی در دکن چہرۂ ہستی افروختہ" [۵۲]

(۲) لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کی تالیف چمنستان شعرا ۱۱۷۵ھ میں یہ پایا جاتا ہے "مولد او خاک پاک اورنگ آباد ست" [۵۳]

(۳) حکیم قدرت اللہ قائم کے تذکرہ مجموعۂ نغز ۱۲۲۱ھ میں یہ الفاظ ہیں "از سکنہ دیار دکن" [۵۴]

(۴) میر تقی میر نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ میں لکھتے ہیں

شاعر ریختہ از خاک اورنگ آباد ست و احوالش کما ینبغی معلوم من نیست [۵۵]

ان کے علاوہ چند اور تذکرے ایسے ہیں جن میں ولی کو دکنی لکھا ہے اور اس صدی میں اہل دکن کے علاوہ صاحب گل رعنا، رام بابو سکسینہ، احسن مارہروی مرتبہ کلیات ولی ۱۹۲۹ء نے صاف صاف دکنی لکھا ہے۔

چوں کہ موجودہ صدی کے تذکرہ نگاروں کے بیانات کے ماخذ اکثر قدیم تذکرے ہیں (اس لئے ہم ان کا تجزیہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں)، ہم نے اوپر جو اقتباسات پیش کئے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں کا ایک گروہ ولی کو گجراتی کہتا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو ولی کو نہ گجراتی کہتا ہے اور نہ اورنگ آبادی۔ اس کے وطن کے لئے انھوں نے صرف لفظ دکن استعمال کیا ہے

---

[۵۱] یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۴۸۴ - [۵۲] صفحہ ۱۴۴ - [۵۳] صفحہ ۱۱۴ - [۵۴] جلد دوم صفحہ ۲۹۶ - [۵۵] صفحہ ۸۹ -

اور دو تذکرہ نگار ایسے ہیں جو دلی کو اورنگ آبادی قرار دیتے ہیں، اس بات کی توضیح کے لئے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ لفظ "دکن" کا کس خطۂ خاک پر اطلاق ہوتا ہے۔

قدما نے لفظ دکن کا اطلاق جس حصہ ملک پر کیا ہے وہ محض اورنگ آباد یا بیجا پور نہیں ہے بلکہ دریائے نربدا کے اس کنارے سے مع سلسلہ کوہ ست پڑا، راس کماری تک کی سرزمین اس میں شامل ہے، اس خطہ میں گجرات وخاندیس بھی شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دکن کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ شمالی ہند کا کوئی شخص لفظ دکن استعمال کرتا ہے تو دکن سے فقط مملکت آصفیہ کا علاقہ مراد نہیں لیتا بلکہ اس کے تصور میں دکن سے مراد ست پڑا سے راس کماری تک کا علاقہ ہوتا ہے (جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں) لیکن جب دکن کے اس وسیع علاقہ میں اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد گجرات اور برار چھوڑ کر باقی علاقہ ہوتا ہے۔ اس امر سے ہر شخص واقف ہوگا کہ بمبئی بلکہ پورے گجرات، کاٹھیاوار، نیز دکن میں شمالی ہند کے تمام باشندے 'ہندوستانی' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں خواہ وہ دہلوی ہوں بنارسی ہوں یا بہاری، لیکن یہی لوگ شمالی ہند میں ہوتے ہیں تو دہلوی، بنارسی، بہاری وغیرہ کہلاتے ہیں، لکھنؤ والے بہاریوں کو پوربی کہتے ہیں لیکن میر صاحب اسی لکھنؤ کے رہنے والوں کو پورب کے ساکنو کے نام سے یاد کرتے ہیں، میر صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

اس شعر میں میر صاحب نے پورے شمالی ہند کے لئے لفظ 'ہند' استعمال کیا ہے اور گجرات ودکن کے خطے کو دکن لکھا ہے۔ مرزا غالب ایک خط میں منشی داد خاں سیاح متوطن سورت کو تذکیر وتانیث کے سلسلہ میں لکھتے ہیں "بھائی ہم نے تم کو یہ نہیں کہا کہ تم مرزا رجب علی بیگ کے شاگرد ہو جاؤ اور اپنا کلام ان کو دکھاؤ، ہم نے یہ کہا ہے کہ تذکیر وتانیث

ان سے پوچھ لیا کرو۔ دکھن اور بنگالے کے رہنے والوں کو اس امر خاص میں دلّی لکھنؤ کے رہنے والوں کا تتبع ضروری ہے"

مندرجہ بالا اقتباس میں بھی دکھن کا لفظ گجرات و دکن کے پورے علاقہ کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

گجرات کے شعرائے متاخرین میں سے ایک شاعر متخلص علوی نے بھی لفظ ہند شمالی ہند کے لئے اس طرح استعمال کیا ہے

اہل سخن یہاں کے بھی سحر البیان ہیں موتی نہیں اگلتے ہیں کچھ شاعران ہند

میر حسن دہلوی ولی کو گجراتی کہتے ہیں لیکن یہ فقرہ بھی قابل غور ہے:۔

"چوں دکھنی است اکثر بزبان خود حرف زدہ است" ۵۱

آزاد بھی گجرات کو دکن ہی میں شامل کرتے ہیں۔ آب حیات میں ایک جگہ تذکرۂ فائق کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"دیکھو تذکرۂ فائق کہ خاص شعرائے دکن کے حال میں ہے اور وہیں تصنیف ہوا ہے" ۵۲

مصنف 'مخزن شعرا'، سید نور الدین قاضی، شہر بھروچ کے قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز تھے، اور خود تذکرہ بھی خاص گجرات کے شعرا کا تذکرہ ہے۔

موجودہ زمانہ میں بھی شمالی اور جنوبی ہند کی تخصیص کے خیال سے گجرات کو دکن ہی میں شمار کرتے ہیں مولوی عبدالحق صاحب نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ 'اردو' میں اس طرح لکھا ہے:۔ دکن میں اردو زبان کے تین بڑے مرکز تھے (۱) گولکنڈہ شاہان قطب

---

۵۱ تذکرہ میر حسن صـ۱۸۴ ۔ ۵۲ فٹ نوٹ آب حیات صـ۹۱

شاہی کا دار الخلافہ (۲) بیجاپور شاہان عادل شاہی کا پایہ تخت (۳) احمد آباد (گجرات) ؎۱

نواب ابراہیم خاں نے گلزار ابراہیمی میں یہ لکھ کر کہ ولی گجراتی ہے اس کے بعد ہی لکھ دیا کہ

"در شعرائے دکن مشہور و ممتاز است"

اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ولی دکن کے شعرا میں مشہور ہے اور گجرات کے شعرا میں نہیں

اس بات کی تحقیق کے بعد کہ لفظ دکن سے کون سا علاقہ مراد لیا گیا ہے ان تذکروں کے بیانات پر غور کیجیے جن میں ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہے اس کے باوجود گردیزی ولی کو اورنگ آبادی نہیں لکھتا بلکہ "در دکن چہرۂ ہستی افروختہ" لکھتا ہے یہاں گردیزی لفظ دکن کو اس کے وسیع معنوں میں استعمال کرتا ہے اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ گردیزی شاہ تجرد کے سلسلہ میں لکھتا ہے "تجرد شاگرد عزلت زادگاہش دکن است" تجرد شاگرد عزلت سورت کے باشندہ تھے۔ اس کو گردیزی کی لاعلمی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اب میر صاحب کے بیان کو دیکھیے کہ ولی کو اورنگ آبادی تو کہہ دیا لیکن ساتھ ہی یہ کہہ کر دامن بچا گئے کہ "احوالش کما ینبغی معلوم من نیست"۔

البتہ شفیق کا بیان واضح اور غیر مبہم ہے لیکن اس نے اپنے بیان کی تائید میں کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اس کے علاوہ حمید خاں جنھیں شفیق کی طرح اورنگ آبادی ہونے کا فخر حاصل ہے بہت واضح طریق پر ولی کو احمد آباد گجرات کا بتاتے ہیں۔ اسی طرح قدرت اللہ قاسم کا "از سکنۂ دیار دکن" کہنا بھی ولی کو دکنی یا اورنگ آبادی ثابت نہیں کرتا۔

خود ولی نے بھی لفظ دکن کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جس شعر میں صرف

؎۱ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص۲۰ ۔ ۵۴ ص۳۰

مملکت آصفیہ مراد ہے وہ یہ ہے :-

دکھن میں تیرے شعر سن شوقی ہوے تیرے ولی   جس کے لگیا ہے دل کے تئیں خوش شعر تجھ دیوان کا

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے ولی اہل دکن تیرے اشعار کے مشتاق ہیں اور انھیں تیرے دیوان کے مطالعہ کا چسکا پڑا ہوا ہے۔ اگر ولی کا وطن دکن (اورنگ آباد) ہوتا تو اس طرح فخریہ اظہار نہ کرتا اپنے دل میں ضرور خوش ہوتا۔ محل افتخار تو یہ ہے کہ وطن سے باہر بھی اس کا کلام مقبول ہے۔

مندرجہ ذیل شعر میں لفظ دکن سے مراد سٹ پڑا سے راس کماری تک کا علاقہ ہے :-

ولی ایران و توران میں ہے مشہور   اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

قلمی نسخوں پر لکھے ہوئے نام :- ولی کی وطنیت کے سلسلہ میں دیوان ولی کے بعض مخطوطوں پر "ولی متوطن دکن" اس کے دکنی ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ جناب ہاشمی صاحب نے اپنی تصنیف یورپ میں دکنی مخطوطات میں دیوان ولی کے ایک مخطوطہ کا ذکر کیا ہے جو سید محمد تقی ولد سید ابوالمعالی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور آخری صفحہ کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

" تمت تمام شد دیوان مغفرت نشان میاں ولی محمد مرحوم متوطن دکن بتاریخ دوہم شہر ذیقعدہ ۱۱۵۶ھ ہجری بروز پنجشنبہ بوقت صبح تحریر یافت مالک و کاتب این دیوان عاجز المذنب محمد تقی ولد سید ابو المعالی است ۔ کسے دعوی کند باطل است[۱]"

اس عبارت سے ہاشمی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ولی دکن کا باشندہ تھا۔[۲] مگر لفظ دکن کے استعمال کی صراحت کو دیکھنے کے بعد ولی کو دکنی ثابت کرنے میں یہ دلیل بالکل وزن نہیں رکھتی۔

فراق گجرات والا قطعہ :- فراق گجرات والے قطعہ سے بعض حضرات یہ استنباط کرتے

۱ـ ایضاً ص ۲۹۹ ـ

ہیں کہ ولی کی زندگی کا بیشتر حصہ گجرات میں گذرا اور جب یہ گجرات سے کسی اور جگہ کا سفر کرتا ہے تو گجرات کی دلچسپیوں سے بیتاب ہو کر یہ قطعہ لکھتا ہے۔ جناب سید محمد صاحب ایم اے نے گلشن گفتار کے مقدمہ میں ایک جگہ یہ لکھا ہے :۔

" ولی نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ گجرات ہی میں بسر کیا۔ وہ احمد آباد میں توطن اختیار کر چکا تھا اور اس کا انتقال بھی وہیں ہوا۔ اپنے اشعار میں اکثر جگہ گجرات کا اس شگفتگی کے ساتھ ذکر کرتا ہے کہ گویا وہ اس کا اصلی وطن تھا۔ کسی سفر میں ایک مثنوی تمام وکمال سورت (گجرات) کے فراق میں لکھی ہے "[۵۱] وغیرہ

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ولی بغرض سیر گجرات گیا تھا اور اس کے ثبوت میں قطعہ کا حسب ذیل شعر پیش کیا جاتا ہے :۔

اس سیر کے نشے سوں اول تر دماغ تھا — آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل

اس قیاس کے حامی لفظ 'سیر' پر اپنے دلائل کی بنیاد رکھتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ولی بغرض سیر و تفریح گجرات گیا تھا۔ اس سلسلہ میں صاحب تذکرۂ شعرائے دکن لکھتے ہیں :۔

" سیر کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی گجرات میں بطریق سیر آیا تھا نہ کہ وہاں کا متوطن تھا اگر متوطن ہوتا تو ایسا نہ لکھتا "[۵۲]

احسن مرحوم کا قیاس سب سے الگ ہے۔ کلیات ولی طبع اول میں اس قطعہ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں :۔

" قیاس ہو سکتا ہے کہ شہر گجرات کے لئے یہ قطعہ کہا گیا ہے جب کہ وہ سید

---

۵۱ مقدمہ ص۱   ۵۲ ص۱۱۳

معالی کے ہمراہ صوبۂ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک گئے ہیں"[1]

چوں کہ ولی کو دکھنی ثابت کرنے کے لئے من جملہ اور دلائل کے اس قطعہ سے بھی استشہاد کیا جاتا ہے ہم اسے یہاں درج کر دیتے ہیں تاکہ قارئین کو صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں آسانی ہو۔

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل
بے تاب ہے سینے منیں آتش بہار دل

مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہاں منیں
شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل

اول سوں تھا ضعیف پہ پابستہ سوز میں
جیوں بال ہے اگن کے اوپر بے قرار دل

اس پیر کے نشے سوں اول تہ دماغ تھا
آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل

سیرے سنے میں آکے چمن دیکھ عشق کا
ہے جوش خوں سوں تن میں مرے لالہ زار دل

حاصل کیا ہوں جگ میں سراپا شکستگی
دیکھا ہے مجھ شکیب سوں صبح بہار دل

ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز
عشرت کے پیرہن کوں کیا تار تار دل

ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں
ہر دم میں بے قرار ہے مثل شرار دل

سب عاشقاں حضور اچھے پاک سرخ رو
اپنا ابیں لہو سوں کیا ہے نگار دل

حاصل ہوا ہے مجکوں ثمر مجھ شکست سوں
پایا ہے چاک چاک ہو شکل انار دل

مجمر نمن ہوا ہے بدن سوز ہجر سوں
اسپند کی مثال ہے آتش سوار دل

افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں
اس مے کدے سوں اُٹھ کے سدہ بسار دل

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں
پھر اس کے دیکھنے کا ہوا ہے امیدوار دل

شعر ہا سے ظاہر ہے کہ ولی گجرات سے باہر کسی اور جگہ ہے اور اسے اپنے محبوب گجرات نے بیتاب کر دیا۔ شعر ۱۲ کی بنا پر لفظ سیر سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ولی گجرات بغرض سیر د

---

[1] کلیات ولی صفحہ ۳۸۵ فٹ نوٹ

تفریح آیا تھا مگر لفظ در اصل گجرات کی سیر کے لئے استعمال نہیں ہوا بلکہ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب ولی باہر گیا ہوگا تو اُس جگہ کی سیر و تفریح سے پہلے تو یہ خوش ہوا لیکن بہت جلد اسے اپنا وطن گجرات یاد آ گیا جس کے لئے کہتا ہے آخر اس کے فراق نے سیر و تفریح کا نشہ اتار دیا۔ اشعار ۷ اور ۸ ملاحظہ فرمائے جہاں ولی اپنے دوست احباب کے ہجر میں بیقرار ہے۔ اس کے جو دوست احباب، اعزا و اقارب اور تلامذہ پائے جاتے ہیں وہ سب گجراتی ہیں۔ ۷ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ولی کو سیر و تفریح کے شوق و ذوق نے اکسایا اور وہ چل پڑا لیکن احباب کے فراق میں اس کا دل گداز ہو گیا اور اس سیر و تفریح کا مزہ جاتا رہا۔ مقطع میں ولی اپنے دل کو اس طرح تسکین دیتا ہے کہ اسے اپنے وطن لوٹنے کی امید ہے ولی کے احباب و اقربا اور اس کے علاوہ دوسری تمام وابستگیوں کو دیکھتے ہوئے ولی کا تعلق گجرات سے بطور سیاح کیسے مان سکتے ہیں۔

بزم الموسی کے ایک مضمون نگار جناب مولانا احسن کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"احسن مارہروی کا قیاس ہے کہ شہر گجرات کے لئے یہ قصیدہ کہا گیا ہے۔ جب کہ وہ سید ابوالمعالی کے ہمراہ صوبۂ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک گئے ہیں" ہماری رائے اس کے خلاف ہے۔ ولی نے سید ابوالمعالی کے ہمراہ پہلا سفر جوانی کے زمانے میں کیا ہے

اول سوں تھا ضعیف یہ پابستہ سوز میں جوں بال اے اگن کے اوپر بے قرار دل

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بڑھاپے کی بات تھی ولی نے زمانہ شباب میں ایک دور دراز کا سفر حجاز مقدس کا کیا یہ سفر نہ صرف خطرناک تھا بلکہ طویل بھی۔ ولی سے نہ رہا گیا، بے اختیار رو دئے اور فراق گجرات میں مرثیہ پڑھا۔ لیکن حج کی برکت اور فیض حق، سے

انھیں یقین تھا کہ وہ گجرات واپس ہوں گے۔

"لیکن ہزار شکر ولی حق فیض سوں   پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل"

مگر یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ شعر میں لفظ ضعیف بڑھاپے کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ یہاں اس سے مراد عاشق کا خستہ و ضعیف دل ہے۔ اس کے علاوہ یہ استدلال حیرت انگیز ہے کہ ولی نے یہ قطعہ سفر حج بیت اللہ کے موقع پر کہا ہو کیوں کہ شعر ۴ میں لفظ سیر استعمال کیا گیا ہے اور سفر حج بیت اللہ کو یقیناً سیر اور تفریح پر محمول نہیں کیا جا سکتا وہ ایک مقدس اور دینی فرض کی ادائیگی ہے نہ کہ سیر و تماشا کے لئے کمر ہمت استوار کرنا ہے۔

غرض اس قطعہ کے سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ولی گجرات میں بغرض سیر و تفریح نہیں آیا تھا بلکہ گجرات اس کا اصلی وطن تھا اور جب سیر کے خیال سے وہ گجرات سے باہر قدم رکھتا ہے تو چند دن وہ بڑے عیش و آرام میں بسر کرتا ہے لیکن آخر کار اپنے محبوب وطن اور احباب و اقربا کی یاد اسے بری طرح ستاتی ہے تو اسی انتہائی عالم کرب و الم میں بے اختیار اپنے وطن کی یاد میں درد انگیز احساسات کا اظہار کرتا ہے۔

لسانی پہلو :

یہ درست ہی کہ ہر مقام کا ایک خاص لب و لہجہ ہوتا ہی کبھی کبھی محاوروں میں بھی معمولی سا فرق آجاتا ہے۔ الفاظ کے تلفظ اور مقامی لہجہ کی وجہ سے ذہن کی رسائی اُس علاقہ کی طرف ہوتی ہے جس جگہ سے ایسا تلفظ اور لہجہ تعلق رکھتا ہے گجراتی میں اس کے لئے کہا جاتا ہے "بارگاودیں بولی بدلائے" یعنی ہر بارہ گاؤں کے فاصلہ پر تلفظ میں فرق آجاتا ہے لیکن یہ سب کچھ عام بول چال تک محدود ہے، ادبی زبان کا حال اس سے مختلف ہوتا ہے۔ ادبی زبان میں مقام کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں آتا۔ ادبی زبان ایک ہوتی ہے اور ہر جگہ اس کے ادب اور اصولوں کی پابندی سختی سے کی جاتی ہے۔ اگر گجرات، مدراس، آسام

یا بنگالہ کا کوئی ادیب یا شاعر اردو میں کچھ لکھے گا تو ادبی زبان ہی میں لکھے گا اور اس وقت وہ اپنے مقامی محاوروں سے پرہیز کرے گا یہاں کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ایسی کوئی ادبی زبان موجود نہ تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی ایک ادبی زبان گجرات اور دکن میں موجود تھی۔ اس کی شہادت دور اول میں صوفیائے کرام کے کلام سے ملتی ہے۔ اس دور کا دکنی اور گجراتی کلام دیکھئے اور غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ گجرات اور دکن دونوں جگہ ایک ہی قسم کی زبان مستعمل تھی اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ باجن اپنے کلام کی زبان کو ایک جگہ ہندی کہتے ہیں اور دوسری جگہ انھوں نے اسی زبان کو دہلوی لکھا ہے۔ اسی طرح خوب محمد چشتی اپنی زبان کو زبان گجرات کہتے ہیں اور علی جیو گام دھنی کے شارح علی جیو کے کلام کی زبان کو گجری کہتے ہیں حالانکہ یہ ایک ہی زبان کے مختلف نام ہیں۔ حاتم کا دکن میں اپنی زبان کو گجری کہنا ہے ایک زمانہ تک مغالطہ ہوا اس الجھن کا ایک حل یہ پیش کیا گیا کہ جو لوگ اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں وہ گجرات کے سمجھے لئے جائیں اور جو اپنی زبان کو دکھنی کہتے ہیں وہ دکھنی ان لئے جائیں۔ اس نتیجہ پہ پہونچنے کا بڑا سبب ہی یہ ہے کہ گجری اور دکھنی میں ایسا لطیف فرق ہے کہ دونوں کو الگ کرنا ذرا دشوار ہے۔

اس زمانہ میں گجرات و دکن میں ایک ہی ادبی زبان کے قائم ہونے کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ جس طرح ۸۰۰ھ میں امیر تیمور کے حملہ کے وقت کئی خاندان دلی سے گجرات میں پناہ گزیں ہو گئے تھے اسی طرح جب گجرات کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو گجرات کے بعض ادیب اور شاعر دکن چلے گئے جہاں ان کا بہت اچھی طرح استقبال کیا گیا[۱] اس طرح گجرات و دکن کے ادیبوں اور شاعروں نے جو زبان استعمال کی وہ ایک ادبی زبان قرار پائی اور ہر جگہ اسی زبان نے رواج پایا۔

عام طور پر دکنی اور گجراتی محاوروں کو الگ کیا جاتا ہے اور لب و لہجہ کی خصوصیات کو بحث میں لایا جاتا ہے

---

[۱] اردو شہ پارے جلد اول ص ۱۳

مگر جن محاوروں اور الفاظ کو ایسا فرق واضح کرنے کے سلسلہ میں پیش کیا جاتا ہے وہ غالباً تمام کے تمام مشترک پائے جاتے ہیں اور تخصیص کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ احسن مرحوم نے کلیات ولی طبع اول میں چند محاورے نقل کرکے حکم لگادیا کہ یہ خالص دکھنی ہیں اور چونکہ ولی نے یہ محاورے دل کھول کر استعمال کئے ہیں اس لئے ولی دکھنی ہے۔ یہاں چند ایسے محاورے نقل کئے جاتے ہیں جو دکھنی ہیں اور آج بھی عام بول چال میں مستعمل پائے جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

دستا یعنی دکھتا۔ نکو = نہیں۔ سگی = جلدی۔ انہوں کو = ان کو۔ ہور = اور۔ وغیرہ

مگر افسوس یہ ہے کہ احسن مرحوم نے اس بات پر غور نہ کیا کہ یہی تمام محاورے اس زمانہ میں گجرات میں بھی مستعمل تھے کیوں کہ یہ اس وقت کی ادبی زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں گجراتی ادب سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

امین ۱۰۹۰ھ یوسف زلیخا۔

کن = کچھو راکھا نہ تھا آپس کے کن رے ۔۔۔ چھڑایا تھا یہ دنیا سیتی من رے
کن = آئے دُر بے بہا ہے مفت دیتا ۔۔۔ نہیں قیمت کچھو کس کن سوں لیتا
انو کی = نین دو نو تھی روشن جو چند رسور ۔۔۔ انو کی جوت سگلی ہو گئی دور

مثنوی موتی سہاگ

نکو = اب نکو عالم کچ کرنا ہلاکی۔

کنے = خلق گئی سب اپنے اوپراں کنے ۔۔۔ منگنے گئے تھے واں بدحالی کو متام

شیخ محمود شیخ فاضل گجراتی ۱۱۸۴ھ

دستا = محمود تجھ میں دستا پورا ہنر وفا کا ۔۔۔ ہے کیا عجب جو بھاوے تو ہو کے اس ہنر سے

حامد = ۔۔۔ نازنین پٹھان (۱۱۴۰ھ تا ۱۱۶۰ھ)

ارے خان ایوی نہ کر بات اسنے ‏ ‏ نہ کر بات ایوی تو کیسر سے کنے
اگر مل کریں کافراں قیل و قال ‏ ‏ شہر سے میں دوں گا انھوں کو نکال

قصہ زیتون و محمد حنیف از مسکین۔

لئی بمعنی بہت۔ لڑا اڈ اسی ساعت سب فوج کوں ‏ ‏ تماشہ دیکھو ان کالی موج سوں
کنے = پاس۔ سکئے مصلحت مل کے چاروں جنے ‏ ‏ گھوڑے اور ہتھیاران ہارے کنے
محمد حنیف ہوں کہا شہ نے ‏ ‏ چھڑانے کو آیا ہوں تیرے کنے
انھوں کو = محل سے ترت سن کے زیتون آئے ‏ ‏ دلاسا انھوں کو کہے دل لگائے
بیگی = حکم ہو تو اب وہ گرم کر کے لاؤں ‏ ‏ میں بیگی سے لاکر تمن کو پلاؤں

گجری کے علاوہ میر صاحب کے کلام میں بھی ان میں سے اکثر الفاظ اور محاورے پائے جاتے ہیں۔

جس طرح دکن کے چند محاورے اور الفاظ ادبی زبان میں شامل ہوگئے تھے اسی طرح بے شمار گجراتی الفاظ دکنی ادب میں بھی پائے جاتے ہیں اور یہ خلط ملط گجرات و دکن کے ادیبوں کے رجحان اور استعمال کا نتیجہ ہے یہاں کلیات محمد قطب شاہ وجہی کی سب رس غواصی کی سیف الملوک بدیع الجمال سے چند ایسے الفاظ درج کرتے ہیں جو گجراتی ہیں یا گجراتی زبان میں مستعمل ہیں مگر دکنی ادب میں بھی پائے جاتے ہیں۔

مثلاً کہواے بمعنی کہلاے۔ گھرے گھر بمعنی گھر گھر۔ پاکر۔ دیکھ۔ رہسے بمعنی رہے کا گجراتی اور پنجابی میں مستقبل کی ترتیب ہے راجستھانی میں س، ہ سے بدل جاتی ہے ببیا۔ میٹھا گجراتی ماضی فعل بنانے کی ترکیب پر ہے۔ نہاسنا یا ناٹھنا بمعنی بھاگنا۔ پچھیں۔ پیچھے آج بھی احمد آباد کی عام بول چال میں مستعمل ہے۔ اس شہر میں نون غنہ زیادہ استعمال ہوتا ہے جیسے آئے کو ان پڑھ اور عوام آیئں سے کہتے ہیں۔ اپاڑنا۔ نکالنا۔ ڈوسا۔ بوڑھا وغیرہ

جب ہم راجستھانی اردو ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں بھی بے شمار دکھنی اور

گجراتی الفاظ پائے جاتے ہیں مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ راجستھانی اردو کے کارنامے کسی دکھنی کے دماغ کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً

اتھا = تھا۔ اہے = ہے۔ ہمن = ہم۔ نکو = نہیں۔ کبل = بہت۔ بیگے = جلدی

ملکو = مل کر۔ ہوکو = ہوکر۔ یہاںنچہ = یہیں۔ کن = پاس

ایسے الفاظ ہیں جو دکھنی اور گجری ادب میں مستعمل ہیں اور راجستھانی ادب میں بھی ملتے ہیں۔

اسی طرح۔ کاڈھنا = نکالنا۔ آپنے = اپنے۔ جدان = جب۔ تیں = تو۔ لاگت = لگتا

پگ = پاؤں۔ پاوتے = پاتے۔ جیب = زبان۔ چھانا = مخفی۔ اوپاڑنا = اکھیڑنا یا اٹھانا۔ کلکلیس (لڑائی جھگڑا) وغیرہ۔ گجری اور دکھنی ہیں مگر انہیں شیرانی مرحوم نے راجستھانی بتایا ہے۔[۱]

(۵) ولی کے کلام کا ایک حصہ ٹھیٹھ قدیم زبان میں ہے۔ اس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دکھنی زبان میں ہے مگر یہ نہ بھولنا چاہیئے اس دور کی ادبی زبان یہی تھی ولی نے پہلے پہل اپنے دور کی زبان میں طبع آزمائی کی مگر بہت جلد اس نے اپنے اجتہاد سے کام لیا اور اس کا صاف کلام اسی اجتہاد کا نتیجہ ہے۔ الغرض لسانی پہلو کی روشنی میں یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ ولی دکھنی تھا جبکہ ہر جگہ قریب قریب ایک ہی قسم کی ادبی زبان رائج تھی۔ اس زمانہ کی ادبی زبان کی خصوصیات کا اندازہ ہمارے مضمون "ولی کی زبان" سے ہو جائے گا اس لیئے یہاں اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

---

[۱] دیکھو مضمون دائرہ کے عہد یوکا اردو ادب کی تعمیر میں حصہ، از پروفیسر حافظ محمود شیرانی۔ اورنیٹل کالج میگزین بابت فروری ۱۹۴۱ء

سیر و سیاحت:۔ ولی کی سیر و سیاحت کے متعلق بیرونی شہادتوں سے جو کچھ پتہ چلتا ہے اور اس کے کلام سے جو کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اتنی ناکافی ہیں کہ اس کے زمانہ کا تعین کرنا بہت دشوار نظر آتا ہے اس سلسلہ میں مولانا آزاد فرماتے ہیں:۔

"افسوس یہ ہے کہ ہماری زبان کے مورخ اور ہمارے شعرا کے تذکرہ نویسوں نے اس کے ولی اور خدا رسیدہ ثابت کرنے میں تو بڑی عرق ریزی کی لیکن ایسے حال نہ لکھے جس سے اس کے ذاتی خصائل اور حالات مثلاً دنیاداری یا گوشہ گیری۔ اقامت یا سیاحی راہ علم و عمل کی نشیب و فراز منزلیں یا اس کی صحبتوں کی مزہ مزہ کی کیفیتیں معلوم ہوں بلکہ برخلاف اس کے سنہ ولادت اور سال فوت تک بھی نہ بتایا" [۵۱]

مولانا احسن کو بھی تذکرہ نویسوں سے یہی شکایت ہے۔

"کسی سیاح شاعر کی سیر و سیاحت ایسی چپ چاپ اور ساکت و صامت نہ ہوگی جیسی ہمارے تذکرہ نویسوں کی غفلتوں سے بیچارے ولی کی دیکھی جاتی ہے" [۵۲]

اس صورت میں ہمیں اس کے کلام کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن اس سے پہلے ہم ولی کی سیاحی کی ان شہادتوں کو دیکھ لیں جن کے متعلق یقین ہے اور اس کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے بلوم ہارٹ نے ولی کی زیارت حرمین شریفین کے متعلق لکھا ہے جناب سید حسینی پیر صاحب کا بھی خیال ہے کہ ولی ۱۱۲۱ھ میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوا تھا اس کے کلام سے اس سفر کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ ولی کے کلام میں قصیدہ در مدح بیت الحرام

---

۵۱ ص ۹۳۔ ۵۲ مقدمہ ص ۱۷۔

اس امر کا غماز ہے کہ ولی نے اس آستانۂ مبارک سے متاثر ہو کر یہ قصیدہ لکھا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے :-

خلقت حق میں تو عرفاں کی نظر کھول کے دیکھ
ذرّے ذرّے کے بھیتر یہاں ہے جدا اک عالم

مذکورۂ بالا شعر میں لفظ یہاں سے ظاہر ہے کہ ولی اس مقام پر بیٹھ کر لکھ رہا ہے۔ اس کا مقطع بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔

آگ دوزخ کی اپچھے اس پہ قیامت میں حرام
اے ولی، صدق سوں دیکھا ہے جو کئی بیت حرم

حج بیت اللہ کے سلسلہ میں ولی کا سورت جانا بھی یقینی ہے۔ چوں کہ عہد عالم گیر میں سورت باب مکہ تھا۔ سورت پر اس کی مثنوی سے بھی ظاہر ہے کہ ولی نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے اپنی آنکھ سے بھی دیکھا ہے۔ سورت کے بالا گھاٹ، قلعہ اور تاپتی پر صبح کو تقریب اشنان سے متاثر ہو کر اپنے تاثرات سپرد قلم کرتا ہے مگر ساتھ ہی آخری شعر میں اپنے اعلیٰ مقصد کی طرف رخش خیال کو موڑ دیتا ہے آخری شعر یہ ہے جس سے مقصد سفر بیت اللہ واضح ہے۔

مہرباں ہو کے اے ساقی کوثر
کرم سوں کشتی مئی مجکوں دے بھر

ایس کے لطف سوں کر دے عطا می
جو اس نشے میں دریا کوں کروں طے

عبث باتاں ہیں بس کر اے ولی آو
نہ کر مقصد سوں اپنے کاہلی تو [51]

[51] کلیات ولی میں صرف دو مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ کلیات کے مقدمہ میں احسن مرحوم نے مضمون کے لحاظ سے ایک ہی مثنوی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے حصہ میں مناجات اور حمد و نعت ہے اور دوسرا حصہ شہر سورت سے متعلق ہے۔ مولانا احسن مقدمہ میں مثنویوں کے متعلق رقمطراز ہیں کہ ممکن ہے کہ حصۂ اول (دہ مجلس) کا ٹکڑا ہو اور یہ قیاس اس لئے ہوتا ہے کہ مثنوی کی تاریخ اختتام ۱۱۲۲ھ ہے۔ اسی بحر میں کہی گئی ہے۔ نیز اسلوب بیان بتاتا ہے کہ کسی خاص کتاب کی تمہید ہے۔" اس تحقیق کے بعد کہ دہ مجلس ولی دیلوری کی تصنیف ہے یہ شبہ دور ہو چکا کہ ولی کی مثنوی (دہ مجلس) کا ٹکڑا ہے مگر اسلوب بیان سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ مثنوی کسی اور مثنوی کا حصہ ہے۔

اگرچہ ولی کے سفر دہلی کے متعلق اس کے کلام میں کوئی شہادت نہیں پائی جاتی مگر قریب قریب تمام تذکرہ نگار اس امر پر متفق ہیں کہ ولی نے بعہد عالم گیر دہلی کا سفر کیا تھا

(۱) نکات الشعراء :- گویند کہ در شاہجہاں آباد دہلی نیز آمدہ بود

(۲) مخزن نکات :- در سن چہل و چار (چہل و چہار) از جلوس عالم گیر بادشاہ ہمراہ میر ابوالمعالی نام سید پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود بجہان آباد آمد۔

(۳) گلزار ابراہیم :- گویند در زمان عالمگیر بادشاہ بہ ہندوستان آمدہ مستفید از شاہ گلشن گردید

(۴) آثار الشعراء :- ابوالمعالی کے ساتھ دہلی میں آئے اور شاہ سعد اللہ گلشن تخلص شاعر زبان فارسی کے مرید اور شاگرد ہوئے۔

(۵) سخن شعرا نساخ :- عالم گیر بادشاہ کے عہد میں دہلی میں آئے تھے۔

(۶) آزاد :- یہ اپنے وطن سے ابوالمعالی کے ساتھ دلی میں آئے۔ یہاں سعد اللہ گلشن کے مرید ہوئے شاید ان سے شعر میں اصلاح لی۔

(۷) بلوم ہارٹ :- ابوالمعالی کے ساتھ اورنگ زیب کے عہد ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) میں دہلی گئے۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ولی نے عہد عالم گیر میں دہلی کا سفر کیا تھا اور اس کے سنہ کے متعلق قائم اور بلوم ہارٹ کا بیان ہے کہ ولی ۱۱۱۲ھ میں دہلی گیا تھا۔ اب تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ولی دوسری بار عہد محمد شاہ میں دہلی گیا تھا۔ آزاد نے یہی لکھا ہے:-

وہ مع اپنے دیوان کے ۱۱۳۰ھ محمد شاہی میں دلی پہونچے۔

مگر ولی کے سنہ وفات کی تحقیق تعیین کے بعد یہ محل نظر ہے۔ محمد شاہ کا عہد حکومت

١٠٣٢ھ تا ١٠٥٥ھ ہے اور ولی ١١١٩ھ ہجری میں انتقال کرتا ہے۔

حمید اورنگ آبادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے برہان پور میں کچھ مدت اقامت کی ہے[٥١] لکھتا ہے :۔

ولی کا برہان پور جانا ممکن معلوم ہوتا ہے کیونکہ علامہ وجیہ الدین کے خاندان کے بعض لوگ خاندیس اور برہان پور میں جاکر آباد ہو گئے تھے۔ علامہ کے حقیقی بھائی شاہ برہان الدین برہان پور میں سکونت پذیر تھے اور اسی جگہ آسودۂ خاک ہیں۔ آج بھی اس خاندان کے لوگ اس جگہ موجود ہیں۔

ولی کے سفر دکن کے متعلق صاحب مخزن شعرا کا بیان ہے کہ "سالہا بدکھن ہمہ گذرانید" اس کے سفر دکن میں بھی کچھ شبہ کی گنجائش نہیں اس کا ایک قابل وثوق ثبوت یہ ملتا ہے کہ اس کے خویش و اقارب دکن میں موجود تھے۔ ولی کے عم بزرگوار سید حفیظ اللہ بہت پہلے سے دکن میں سکونت اختیار کر چکے تھے[٥٢]۔ شاہ برہان الدین کے فرزند شاہ ہاشم علوی ١٠٥٨ھ بیجاپور کے مشاہیر اولیا میں سے تھے ولی کے نسبتی بھائی شیخ فرید عہد عالمگیر میں بمقام اورنگ آباد تھے اور وہیں ١١٤٢ھ[٥٣] میں انتقال کیا۔ غرض خاندانی تعلقات کی بنا پر ولی کا دکن جانا قرین قیاس ہے۔

تلمذ :۔ ولی کی تعلیم و تربیت احمد آباد میں ہوئی۔ اس نے علوم عقلی و نقلی میں مولانا شیخ نورالدین[٥٤] سہروردی سے اکتساب کیا۔ مولانا شیخ نورالدین۔ ۱۲ شہر جمادی الاول کو ١٠٦٣ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ اتنے ذکی و ذہین تھے کہ سات سال کی عمر میں اپنے والد سے سات روز میں گلستان پڑھ

---

٥١ صہ ٨ ٥٢ گلزار آصفیہ صہ ٣٥٢ ٥٣ اعراس نامہ مطبوعہ پیر صاحب

٥٤ مرآۃ احمدی خاتمہ۔

لی۔ آپ نے بعض علوم ظاہری مولانا احمد بن سلیمان سے اور سید محمد ابوالمجد محبوب عالم سے فن قرأت اور علم حدیث حاصل کیا۔ تمام سلسلوں کی اجازت بھی محبوب عالم سے حاصل تھی۔ آپ ڈیڑھ سو سے زائد تصانیف کے مالک ہیں۔ آپ روزانہ ایک ختم قرآن کرتے، ہر شب دو بار صوۃ اللیل ادا کرتے اور ہر بار کروٹ لیتے وقت ایک ہزار بار تہلیل کرتے اور دو ہزار بار درود پڑھتے۔ ۱۵ سال کی عمر سے آخر دم تک اربعین اور اعتکاف قضا نہ ہوئے۔ آپ نے کبھی سیم وزر کو چھوا تک نہیں۔ آپ کے ایک شاگرد و عقیدت مند مولانا اکرم الدین مخاطب بہ شیخ الاسلام خاں صدر صوبہ احمد آباد نے آپ کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیہ خرچ کر کے ایک مسجد و مدرسہ تعمیر کرایا تھا اس مدرسہ کا سنگ بنیاد ۱۱۰۹ھ میں رکھا گیا اور ۱۱۱۱ھ میں یہ تیار ہوگیا۔ اسی "مدرسہ ہدایت بخش" کی تعریف میں ولی نے رسالہ نور المعرفت لکھا ہے۔

مولانا ۱۱۲۴ھ میں زیارت حرمین شریفین کیلئے گئے تھے۔ آپنے بانوے سال کی عمر میں دوپہر سہ شنبہ کو بتاریخ ۹ شعبان ۱۱۵۵ھ میں انتقال کیا۔ کسی نے تاریخ کہی ہے "وارث اہل بیت"۔ آپ کی اولاد میں پانچ پسر[۱] اور تین دختر

---

[۱] مولانا شیخ نور الدین کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد صالح عرف پیر پا با مولانا کے جانشین ہوئے۔ آپ بڑے ذکی اور عالم باعمل تھے۔ شاہزادہ اعظم شاہ نے بہ عہد صوبیداری آپ سے قرآن کریم سنا بخلعت وجاگیر عطا کی۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کے دور میں انکی طلبی پر دہلی تشریف لے گئے تھے، اور عطایائے شاہی سے سرفراز ہوئے شاہجہاں آباد میں ۲۰ جمادی الثانی ۱۱۴۷ھ میں آپ کا وصال ہوا نعش مبارک احمد آباد لائی گئی اور جد بزرگوار شیخ محمود کے مقبرے میں سپرد خاک کی گئی۔ شیخ محمد صالح کے پانچ فرزند بہاء الحق۔ صدر الحق، رکن الحق، رضاء الحق، اور فیض الحق تھے مولانا شیخ نور الدین کے دوسرے فرزند قاضی محمد نظام الدین تھے آپ ریاضیات میں ید طولی رکھتے تھے انشا اور شاعری میں ماہر تھے۔ امرائے گجرات کی طرف سے بڑی جاگیریں عطا ہوئی تھیں ۱۱۵۱ھ میں احمد آباد کے قاضی القضاۃ ہوئے۔ ۱۲ ذیقعدہ ۱۱۶۴ھ میں وصال ہوا۔ اور اپنے والد کی خانقاہ میں دفن ہوئے مولانا کے تیسرے فرزند شیخ محمود عرف شیخ بڑا جوان بھی لائق وفائق تھے افسوس کہ عنفوان شباب میں لاولد انتقال کیا چوتھے فرزند شیخ فخر الدین عرف شیخ بزرگ، مادر زاد اصم و ابکم تھے، خط نسخ و نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ بارہا کلام اللہ کتابت فرمایا پانچویں فرزند ابوالبصیر بہاء الدین بھی صغر سن ہی میں انتقال کر گئے۔ ص ۵۶-۵۷-۵۸ مرآۃ احمدی خاتمہ۔

تھیں جن میں شیخ محمد صالح سب سے بڑے تھے۔

شاعری میں ولی کے استاد شاہ گلشن تھے جیسا کہ میر حسن اور دی تاسی نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ خود ولی بھی نور المعرفت کے اختتام پر اس امر کا اظہار کرتا ہے

"مصنف این عبارت کہ ہمین شاپردازی بزرگان بخطاب ولی سرفراز است واز شاگردی زبدۃ العارفین حضرت شاہ گلشن ممتاز"

شیخ سعد اللہ دہلوی کا نسب نامہ مشہور صحابی حضرت زبیر بن العوام تک پہنچتا ہے۔ شاہ صاحب شاہ گل سرہندی متخلص وحدت بن شیخ محمد سعید بن شیخ احمد مجدد سرہندی کے مرید تھے اس نسبت سے انھوں نے تخلص شاہ گلشن اختیار کیا تھا۔ شاہ صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ اسلام خاں سلاطین گجرات کے عہد میں وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ نے برہان پور میں بود و باش اختیار کی اور آخر میں شاہ صاحب برہان پور چھوڑ کر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ سرو آزاد کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سیر و سیاحت کے خیال سے اپنے آبائی وطن احمد آباد میں بھی آئے تھے۔ شاہ صاحب نے ۱۱۴۱ھ میں انتقال کیا۔ یہ صاحب دیوان تھے ان کے دو شعر سرو آزاد میں دیے ہیں[۵]

بچشم خویش نگر سحر سامری این است نظر بہ آئینہ کن شیشہ و پری این است

گشتم شہید تیغ تغافل کشیدنت جانم زدست برد غزالانہ دیدنت

عام طور پر مشہور ہے کہ شاہ صاحب سے ولی کی ملاقات بمقام دہلی ہوئی لیکن شاہ صاحب کی اقامت برہان پور اور سیر احمد آباد اور ولی کے قیام برہان پور اور سکونت

۵۔ سرو آزاد ص ۱۹۹

احمد آباد کے پیش نظر یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ ولی اور شاہ صاحب کے تعلقات کا آغاز ان ہی میں سے کسی ایک جگہ پر ہوا ہوگا۔

احباب و تلامذہ:۔ ولی کے کلیات میں اس کے چند احباب کا ذکر ملتا ہے ان میں سید ابوالمعالی اس کا بہت ہی جاں نثار دوست تھا۔ سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہا ہے بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ سید معالی کا سفر دہلی میں ولی کا ہم رکاب تھا۔ حمید اورنگ آبادی کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سید معالی گجرات کا شاہزادہ تھا[۵۱] مخزن نکات میں صرف ' سید پسرے ' لکھا ہے۔ ولی نے سید معالی کا سراپا بھی باندھا ہے[۵۲]

کلیات میں ایک نام شمس الدین بھی ملتا ہے۔

ہر طرف جگ میں ہے روشن نام شمس الدین کا   چمن میں ہے شور حسن کے ابرو سے پرچمن کا[۵۳]

جناب حسینی پیر صاحب کا بیان ہے کہ یہ شمس الدین اسی خاندان کے ایک فرد شاہ سراج کے فرزند تھے شاہ سراج ولی کے ہمعصر تھے ان کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا۔

ولی نے اپنے اعزا کامل و اکمل کا بھی ایک جگہ ذکر کیا ہے۔

نام تیرا دلی سنے اے اکمل   شوق سوں ورد صبح و شام کیا[۵۴]

ولی اس ماہ کامل کی حقیقت جو نہیں سمجھا   وہ ہرگز نہیں سمجھا عالم میں اکمل کے معانی کوں

کامل اور اکمل دونوں حقیقی بھائی تھے اور اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

ولی نے محمد مراد فوجدار[۵۵] گودھرا (علاقہ گجرات) کا بھی ایک جگہ اس طرح ذکر کیا ہے۔

مقصود دل ہے اس کا خیال اے ولی مجھے   جو مجھ زباں کا ورد محمد مراد ہے

اسی طرح بڑی خوبی سے محمد یار خاں کا نام بھی لایا ہے۔

---

[۵۱] ص۸۰ [۵۲] کلیات ولی ص۲۲۲ [۵۳] ص۲۳ [۵۴] ص۵۲ [۵۵] ص۵۵ [۵۶] مآثر الامراء ج ۳ ص۶۸۲ تا ص۶۹۳ بحوالہ مضمون جناب قاضی اختر میاں اختر مصنف ہذا!

کیوں نہ ہوئے عشق سوں آباد یہ ہندوستاں　　حسن کی دلّی کا صوبہ ہے محمد یار خاں

محمد یار خاں دہلی کا ناظم رہ چکا ہے۔ جناب اختر صاحب کا خیال ہے کہ ولی کے قیام دہلی کے زمانہ میں ان سے ولی کے تعلقات رہے ہوں گے وغیرہ [۵۱]

ان کے علاوہ ولی نے اپنے چند ہندو احباب کا بھی ذکر کیا ہے۔ گوبند لال۔ امرت لال کھیم داس اور بیرلال کے نام ملتے ہیں۔ ایک غزل کے مطلع میں کھیم داس کی تعریف اس طرح کرتا ہے ؎

ہے بسکہ آب و رنگ حیا کھیم داس میں　　آتا نہیں کسی کے خیال و قیاس میں

ایک جگہ بیرلال کا ذکر کرتا ہے ؎

دیکھا ہے بیرلال کوں اکرم کے باغ میں　　پہنچی ہے بوئے عشق کی اس کے دماغ میں

امرت لال اور گوبند لال کے نام تو مستقل غزلیں کہی ہیں۔

ولی کے شاگرد بہت ہونے چاہئیں مگر صرف اشرف [۵۲]، رضی اور ثنا کا پتہ چلتا ہے۔ حمید اورنگ آبادی نے گلشن گفتار میں اشرف کا ذکر کیا ہے۔ سید محمد اشرف نام تھا اور تخلص اشرف احمد آباد کے رہنے والے تھے۔ یہ صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔ انھیں شاہ عالم بخاری قدس سرہٗ سے عقیدتمندی تھی ان کے دیوان کا ایک نسخہ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے کتب خانہ میں موجود ہے اس میں بعض جگہ اشرف شاہی لکھا ہوا ہے۔ ولی نے اشرف کے ایک مصرع کو اس طرح تضمین کیا ہے۔

---

[۵۱] رسالہ معنف [۱۲] صفحہ ۱۳۴

[۵۲] جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر نے اشرف پر ایک مفصل مضمون رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۴۷ء میں سپرد قلم کیا ہے۔

اشرف کا یو مصرع اولی مجھ کوں ہے دلچسپ — الفت ہے دل وجان کو میرے ہیم نگر سوں

کلام کا رنگ قریب قریب ولی کے رنگ کا سا ہے۔

حمید نے ولی کے دوسرے شاگرد رضی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا نام حافظ رضی الدین رضی تخلص تھا۔ رضی کا بہت تھوڑا کلام دستیاب ہوا ہے۔

فائق کے تذکرہ مخزن شعرا سے ولی کے ایک شاگرد ثناء کا پتہ چلتا ہے۔ شیخ ثناء اللہ ثنا احمد آباد کے شیخ زادوں میں سے تھا۔ اس نے کسب فیوض مولانا شیخ نور الدین سہروردی سے کیا تھا اور شاعری میں ولی کا شاگرد تھا۔

شفیق نے چمنستان شعرا میں معتبر خاں عمر کو ولی کا شاگرد بتایا ہے لیکن اس کے وطن کے متعلق خاموش ہے۔ میر حسن کے تذکرہ اور مخزن نکات سے ولی کے ایک شاگرد فخری کا پتہ چلتا ہے۔ فخری دکنی تھا۔

معاصرین :۔ ولی کے ہم عصر شعرا میں سے ولی نے ناصر علی سرہندی، فراقی اور آزاد کا ذکر کیا ہے۔ ناصر علی کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

پڑے سن کر اچھل جیوں مصرعہ برق — اگر مصرعہ لکھوں ناصر علی کوں

جناب ہاشمی صاحب کا خیال ہے ناصر علی کے شاگرد نے اس کے جواب میں یہ لکھا تھا۔

باعجاز سخن گر اوڑ چلے توں — نہ پہونچے گا ولی ہرگز علی کوں[۵۱]

---

[۵۱] مقالات ہاشمی ص ۱۳۸ ۔ مگر صاحب تذکرہ شعرائے دکن کا خیال ہے کہ ولی کے جواب میں افضل خاں سرخوش نے ناصر علی کی تعریف میں ایک رباعی لکھی جس کا ایک مصرع ولی کے شعر کا جواب ہے۔ مصرع:۔ با شعر علی کمی رسد شعر ولی مذکورۂ بالا شعر دراصل عزیز دکھنی کا ہے۔ تذکرہ محبوب الزمن ص ۱۱۲۰ ج ۲

فراقی گجرات کا ایک شاعر تھا اس سے ولی کی حریفانہ چشمک رہتی تھی جو اس مصرع سے واضح ہے ؎

ترے اشعار ایسے نئیں فراقی
کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں

لیکن ولی اپنے حریف کے کمال کی داد دینے میں بھی بخل نہیں کرتا اور فراقی کا مصرع اس طرح تضمین کرتا ہے ؎

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وہ ظالم
کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آوے

فراقی کا شعر یہ ہے ؎

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کہ وہ ظالم
کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آوے

ولی نے اپنے ایک دکھنی معاصر فقیر اللہ آزاد کا ذکر کیا ہے ؎

آزاد سے سنیا ہوں یو مصرع مناسب
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد کا شعر یہ ہے ؎

کوئی کسی ہی فن میں ہم ساتھ بر نہ آیا
پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

ولی کا ایک ہمعصر شاعر احمد گجراتی تھا۔ حدیقۂ احمدی مخزن نکات اور تذکرہ گلزار ابراہیم میں اسے معاصر ولی لکھا ہے۔ شفیق نے صرف قدیم شاعر لکھا ہے۔ میر صاحب نے صرف ایک شعر دیا ہے۔

ولی کے کلام میں ایک جگہ علی رضا کا نام آتا ہے ؎

نقد شاہ نجف ولی اللہ
پیر کامل علی رضا پایا

شاہ علی رضا سرہندی نے گجرات میں سکونت اختیار کی تھی۔ مجلس حال و قال میں اکثر ان کی آنکھوں سے اشک خونی جاری و ساری رہتے۔ آپ کو خرقۂ خلافت میاں شیخ یحییٰ چشتی سے ملا تھا اور سلسلۂ نقشبندیہ میں ارادت رکھتے تھے۔ دکن کے بعض امرا آپ کے مرید تھے۔ شاہ صاحب نے ۱۲ر ذیقعدہ ۱۱۴۲ھ میں انتقال کیا[1]

فتوحات کے ریاض حسنی میں لکھا ہے کہ ولی کو شاہ علی رضا سے بیعت حاصل تھی۔

"دست بیعت بجناب حضرت شاہ علی رضا گجراتی قدس سرہ دارد"[2]

کسی اور جگہ ولی کے مرشد کے متعلق کوئی شہادت نہیں پائی جاتی اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ولی نے شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی یا نہیں ولی کے نام کے سلسلہ میں ہم نے ایک مہر پیش کی ہے جس میں "خاک نعلین غوثی محمد ولی اللہ ابن شریف محمد علوی" لکھا ہے۔ مگر اس سے یہ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ولی شطاریہ سلسلہ میں مرید تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مختلف سلسلوں میں مرید ہوا مگر اس امر میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وفات:۔ ولی کے وطن کی طرح اس کے سنہ وفات کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ چوں کہ کسی مصنف یا تذکرہ نویس کے پاس اس سلسلہ میں کوئی قطعی دلیل نہ تھی اس لئے قیاس آرائی سے کام لیا گیا۔ اگر مولوی سیّد احمد نے فرہنگ آصفیہ میں ولی کی تاریخ وفات ۱۱۳۹ھ دی تو تذکرہ شعرائے دکن کے مولف نے ۱۱۵۵ھ کو ولی کا سنہ وفات ٹھہرایا۔ چونکہ بعض اہل علم نے "دہ مجلس" ولی کی طرف منسوب کی اس لئے یہ قیاس کیا گیا کہ ولی کم از کم ۱۱۴۱ھ تک زندہ تھا۔ بعض اور حضرات نے اس شعر کی بنا پر

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

---

[1] مراۃ احمدی خاتمہ ص۲ [2] بحوالہ مقالات نصیر الدین ہاشمی ص۲۲۵ [3] فرہنگ آصفیہ ج ۴ ص۶۵۶

یہ استدلال کیا کہ ولی محمد شاہ کے عہد حکومت کے بعد تک ضرور زندہ تھا۔ ان قیاسات کو دیکھ کر حافظ کا مشہور عالم مصرع یاد آجاتا ہے[۹۱]۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

خدا بھلا کرے ڈاکٹر عبدالحق صاحب مدظلہ کا جن کو جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں ولی کی وفات پر ایک تاریخی قطعہ ملا اور جس کی تائید ہمارے محترم بزرگ جناب سید منظور حسین صاحب علوی المعروف بہ حسینی پیر کے خانگی کتب خانہ سے بھی ہوئی۔ پیر صاحب نے بتلایا کہ اس قطعہ کے مصنف احمد آباد کے مفتی احسن[۹۲] ہیں۔ دوسرے اہل علم یقیناً ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے شکر گذار ہوں گے لیکن خدا جانے مولوی یحییٰ تنہا صاحب غازی آبادی نے اپریل ۱۹۳۳ء کے "زمانہ" کانپور میں عبدالحق صاحب کی تحقیق سے کیوں اختلاف کرتے ہوئے تذکرۂ شعرائے دکن کے بیان کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس میں حسب ذیل دلائل پیش کئے:۔

(۱) وہ مجلس کا سنہ تصنیف ۱۱۴۱ھ ہے۔

(۲) مولف تذکرۂ شعرائے دکن نے ولی کی صحیح تاریخ وفات دی ہے۔

(۳) ۱۱۱۹ھ ولی رام ولی کی تاریخ وفات ہوگی۔

تنہا صاحب کے بیانات کی مدلل تردید پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے ایک شاگرد جناب سردار عبدالحمید نے اورینٹل کالج میگزین بابت اگست ۱۹۳۴ء میں شائع کی۔

ان کی تنقیحات یہ ہیں:۔ (۱) صاحب فرہنگ آصفیہ کا دیا ہوا سنہ وفات کسی کو بھی قابل قبول نہیں۔ (۲) صاحب تذکرۂ شعرائے دکن نے بغیر کسی یقین و اذعان کے سنہ وفات دیا ہے:۔ "کہتے ہیں ۱۱۵۵ھ کے قریب احمد آباد گجرات میں فوت ہوا"[۹۲]

---

[۹۱] مولانا احسن محمد شاہ کے عہد میں احمد آباد کے مفتی تھے۔ [۹۲] ص ۱۱۲۳

سنہ وفات کے بارے میں قوی دلیل کے طور پر "دہ مجلس" کے سنہ تصنیف کو پیش کیا جاتا ہے۔ احسن مرحوم نے کلیات ولی میں بھی "دہ مجلس" کے سنہ تصنیف کی شہادت پر ۱۱۵۵ھ کو ولی کی تاریخ وفات قرار دیا۔ مگر "دہ مجلس" کے حقیقی مصنف کے متعلق تلاش و تحقیق کے بعد یہ قیاس ناقابل قبول ٹھہرا۔ "دہ مجلس" دکن کے ایک اور ولی[1] کی تصنیف ہے۔

---

[1] دہ مجلس کا مصنف ویلور کا باشندہ محمد فیاض متخلص ولی ہے اس نے ملا حسین واعظ کاشفی کی روضۃ الشہدا کو اردو میں منظوم کیا۔ چوں کہ اس میں ہر باب کے لئے "مجلس" لکھا ہے اور ایسے دس باب ہیں اس لئے اسے "دہ مجلس" بھی کہتے ہیں۔ اس مثنوی کا ہمارے ولی سے کوئی تعلق نہ ہونے کی طرف سب سے قدیم حوالہ غلام محمد منظور کا مرتب کردہ دیوان ولی ۱۲۹۰ھ میں ملتا ہے۔ منظور ولی کو اہل سنت والجماعت ثابت کرنے کی غرض سے یہ عبارت لکھتا ہے:۔

یہ بھی محتجب نہ رہے کہ اس بندر معمورۂ بمبئی کے قریب ملک دکن میں ولی محمد نام ولی تخلص ایک شاعر زمانۂ پاسیتن میں گذرا ہے جس نے روضۃ الشہدا کا احوال زبان ہندی میں منظوم کیا ہے وہ غیر ذالک ہے یہ ولی نہیں... ... یہ شخص طاہر دکھنی کا جو کہ فارسی میں نامی شاعر گذرا ہے ہمعصر تھا مذہب ان دونوں کا امامیہ تھا... ... مصنف اس دیوان کا ولی الدین ولی احمد آبادی اہل سنت وجماعت سے تھا وغیرہ ص۱۲۔ دیوان ولی مرتبہ منظور مطبع حیدری بمبئی۔

ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے میں اس امر پر روشنی ڈالی ہے اور واضح کیا ہے کہ "دہ مجلس" ولی ویلوری کی تصنیف ہے۔ اس کے سنہ تصنیف میں اختلاف ہے۔ حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے اردوئے قدیم میں سنہ تصنیف ۱۱۱۹ھ لکھا ہے ص۱۰۳۔ احسن مرحوم نے ۱۱۴۱ھ دیا ہے اور یہ شعر پیش کیا ہے۔ ہوا ختم جب دردکا حال گیارا سو تھا اکتیسواں سال کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول — جناب ہاشمی صاحب نے یورپ میں دکھنی مخطوطات میں یورپ کے نسخوں کے حوالے سے ۱۱۳۰ھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے میں لکھا ہے کہ مطبوعہ نسخوں میں ۱۱۱۹ھ ہے اور انڈیا آفس لائبریری کے نسخے میں ۱۱۳۴ھ دہ مجلس کا سنہ تصنیف پایا جاتا ہے۔ ص۱۴۵

تنہا صاحب کی دلیل کہ ۱۱۱۹ھ ولی رام کا سنہ وفات اس کے جواب میں جناب سردار عبدالحمید نے ولی رام[1] کا سنہ وفات یہ دیا ہے:-

تاریخ وصال ولی رام صاحب   از جام یقین شدہ مست

سردار صاحب نے جناب تنہا کے اس قیاس کی تردید میں یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ ولی کے سنہ وفات کا مصرع بادپناہ ولی ساقی کوثر علی مسلمانی جذبات کا مظہر ہے جو ایک ہندو شاعر کے سنہ وفات کا مصرع نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ ہمارے سامنے ولی کا صحیح سنہ وفات موجود نہیں تاہم اسی کے زمانۂ حیات کو متعین کرنے کی غرض سے چند بیرونی شہادتوں کی طرف قارئین کرام کی توجہ مبذول کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حسینی پیر صاحب کے پاس ایک دستاویز ہے جس کا سنہ تحریر ۱۱۲۰ھ ہے اور اس پر ولی کی مہر ثبت ہے۔ اس سے ولی کا ۱۱۲۰ھ تک بقید حیات ہونا ثابت ہے۔ ولی کے رسالہ نور المعرفت کا سنہ تالیف تو متحقق نہ ہو سکا لیکن یہ یقینی ہے کہ رسالہ ۱۱۰۹ھ کے بعد کی تالیف ہے چونکہ رسالہ جس مدرسہ کی تعریف میں لکھا گیا ہے وہ مدرسہ ۱۱۰۹ھ اور ۱۱۱۱ھ کے درمیان تعمیر ہوا[2] ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۱۱۱ھ میں ولی زندہ تھا۔ پنجاب یونی ورسٹی میں دیوان ولی کا ایک نسخہ رکھا گیا تھا جسے ۸ سنہ جلوس محمد شاہی (م ۱۱۳۸ھ) میں ثناء اللہ فانی نے لکھا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:-

"دیوان اشعار ولی مسمی سید ولی محمد مرحوم بتاریخ چہاردہم شہر محرم الحرام سنہ ۸

[1] ولی رام ولی پنجاب کا باشندہ تھا۔ اس نے تصوف میں کئی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں بعض طبع بھی ہو چکی ہیں۔ اس کی ایک مثنوی بحر عرفان گیان پریس گوجرانوالہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس مثنوی کے خاتمہ پر اس کا سنہ وفات ملتا ہے۔ (اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۴۲ء ص ۲۴)

[2] مراۃ احمدی خاتمہ۔

از جلوس میمنت مانوس محمد شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ روز چہار شنبہ وقت چاشت در بلدہ خیر البلاد احمد آباد حمیت عن العناد بخط فقیر حقیر اضعف العباد و کلب محبوب سبحانی نمودے بود ثناء اللہ فانی سمت انجام و صورت اتمام پذیرفت"[۱۵]

مندرجہ بالا اقتباس میں ولی کو مرحوم لکھا ہے لہٰذا یہ یقینی ہے کہ ولی ۱۱۳۸ھ میں زندہ نہ تھا مگر اس کے سنہ وفات کی بڑی شہادت یہ قطعہ ہے۔

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل　　والی ملک سخن صاحب عرفان ولی
سال وفاتش خرد از سر الہام گفت　　بادشاہ ولی ساقی کوثر علی

آخری مصرع کے اعداد ۱۱۱۸ ہوتے ہیں تاریخ گو نے سر الہام (۱) سے تعمیہ کر کے ۱۱۱۹ پورا کیا ہے۔ بمبئی کتب خانہ کا یہ نسخۂ دیوان ولی جس پر مندرجہ بالا قطعہ درج ہے ۲۱ سنہ جلوس محمد شاہی (م ۱۱۵۲ھ) میں لکھا گیا ہے اور اس کے مصنف مولانا احسن مفتی ہیں۔ ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے رسالہ اردو بابت مارچ ۱۹۳۴ء میں اس کو شائع کر دیا ہے۔ تنہا صاحب کے جواب میں سردار عبد الحمید نے اس نسخہ کے حوالہ سے ایک یہ بھی دلیل پیش کی ہے کہ جب ولی ۱۱۵۵ھ تک بقید حیات تھا تو ۱۱۵۲ھ میں مفتی احسن نے ولی کی وفات سے تین سال قبل قطعہ سنہ وفات کیوں کہا؟

اعراس نامہ مملوکہ پیر صاحب میں ولی کی تاریخ وفات ۱۴ شعبان اور وقت عصر لکھا ہوا ہے لہٰذا اب اس قطعہ اور اعراس نامہ کے پیش نظر یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ولی نے بتاریخ ۱۴ شعبان بوقت عصر ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اس کے بعد کسی قسم کی قیاس آرائی اور شبہ کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔

مدفن:۔ ولی کو اس کے خاندان کے قبرستان "نیلی گنبد" میں دفن کیا گیا۔ اس قبرستان

---

[۱۵] اورینٹل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۶

ہیں علامہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان کے کئی بزرگوں کے مزارات ہیں۔ نیلی گنبد شہر سے کچھ فاصلہ پر بمقام شاہی باغ واقع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاہجہاں کا محل اور مغلوں کے زمانہ کی دوسری عمارتیں اس وقت بھی موجود ہیں۔ ولی کے مزار پر چینی کی ٹکڑیاں جڑی ہوئی تھیں اس لئے یہ چینی پیر کے نام سے بھی مشہور ہے۔

ولی کی علمی استعداد

ولی کے بارے میں ہمارا سرمایۂ معلومات محدود ہونے کی وجہ سے اردو کے اس بڑے محسن اور شاعر کی علمی استعداد کے متعلق بعض حلقوں میں شک اور تذبذب کا اظہار کیا گیا ہے ، کہیں اس کی عربی سے ناواقفیت کا ذکر کیا گیا ہے اور کہیں بعض عروضی مسامحات کی بنا پر اسے عروض کے نکات سے ناآشنا ٹھہرایا گیا ہے۔ شمس العلما آزاد اپنے قابلِ قدر تذکرۂ "آبِ حیات" میں یوں رقم طراز ہیں :۔

"اُن کی علمی تحصیل کا حال ہماری لاعلمی کے اندھیرے میں ہے .... چناں چہ ان کے اشعار سے معلوم ہوگا کہ قواعدِ عروض کی طرح زبانِ عربی سے ناواقف تھے .... یہ سیرِ کتاب کا شوق اور علما کی صحبت کی برکت ہے"۔ [1]

اگرچہ "کلیاتِ ولی" کے لائق مرتب احسن مارہروی ولی کے علمی کمالات کے حق میں کوئی یقینی فیصلہ صادر نہیں کر سکے اور مخالفوں کے اعتراض کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ

"ممکن ہے کہ ولی نے عربی میں درسِ نظامیہ پورا نہ کیا ہو اور بہت ممکن ہے کہ فارسی میں بھی گلستاں و بوستاں کے آگے طغرا و بدرچاچ کے خارستان میں نہ اُلجھے ہوں"۔

تاہم ولی کے ذوقِ سلیم اور طبعِ رواں [2] کے قائل ہونے کے ساتھ آزاد کی رائے سے مندرجۂ ذیل الفاظ میں اختلاف کا اظہار کرتے ہیں :۔

---

[1] صفحہ ۹۱،۸ تا ۹۳

"مگر یہ کہنا کہ وہ (ولی) عربی و عروض سے ناواقف تھے خلافِ واقعہ ہے
......اسی طرح بعض عربی و فارسی کے الفاظ متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک
لکھ دینے سے ان کی جہالت و ناواقفیت نہیں ثابت ہوتی، سیر و تلاش سے معلوم
ہوگا کہ وہ لوگ بھی جن کی مشرقی فضیلت مسلّم تھی (ولی) سے سو برس بعد تک
ایسی حرکات و سکنات کے عادی رہے ہیں"[۵۱]

اس قسم کی مسامحات کی مثالیں انھوں نے خانِ آرزو، شاہ حاتم، آبرو مومن اور
آتش کے کلام میں بھی دکھائی ہیں حالانکہ ان میں سے بعض بزرگوں کی علمی فضیلت مسلّم ہے۔
ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی "اردو شہ پارے" جلد اوّل میں ولی کی طرف
سے اسی قسم کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جب ہم "کلیاتِ ولی" پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے، اگر
ایک طرف ہمیں اس کی علمی استعداد کا قائل ہونا پڑتا ہے تو دوسری طرف اساتذۂ فارسی کے کلام
سے اس کی کامل واقفیت بھی ایک امرِ واقعی دکھائی دیتی ہے، ان عقلی و نقلی علوم کا آسانی سے اندازہ کیا
جا سکتا ہے جن کی طرف ولی کی طبیعت کا میلان تھا، اس کے کلام کے مطالعے سے ہم اس
نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ولی اپنے زمانے کے علوم میں کافی دست گاہ رکھتا تھا اور اکثر کتبِ متداولہ
اس کے مطالعے میں رہ چکی تھیں۔ قرآن، تفسیر، فقہ، فلسفہ، ہیئت، معانی اور تصوّف سے
اس کا لگاؤ ظاہر ہے۔ اس نے کئی جگہ اپنے اشعار میں قرآنی آیات کے ٹکڑے بڑی قابلیت سے
کھپائے ہیں، ذیل کی مثالیں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ولی قرآن کے معنی سے نابلد تھا ؎

سجن کا مکھ منوّر، نورِ آیت فالِ مصحف تھا کہ اہلِ نامراداں پر دعا سے حل اتٰی حافظ [۵۲]

---

[۵۱] دیباچہ ص۲۴، [۵۲] کلیاتِ ولی، ص۱۱۹

رات کو آؤں اگر تیری گلی میں ای حبیب　　　زیورِ لب ذکر سبحان الذی اسریٰ کروں [۵۱]

چہرۂ گل رنگ و زلف موج زن خوبی منیں　　　آیتِ جنات تجری تحتہا الانہار ہے [۵۲]

وہ جو پاوے مطلب راضیۃ مرضیۃ　　　محض للہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے [۵۳]

تمام پات تسبیح بحمدہ کے بہ حکم　　　زبان حال سوں کرتے ہیں ذکر سبحانی [۵۴]

پیغمبرِ اسلام صلعم کی شان میں تحسین و تعریف کے پھول برساتے ہوئے وہ حدیثِ نبوی کی طرف اشارہ کرتا ہے ؂

زینوا الصوتکم کا گر سنے داؤد ناد　　　ہووے خوش در بار پر تیرے خوش الحانی کرے [۵۵]

زلف و رُخ کو لیل و نہار سے تشبیہہ دیتے ہوئے واللیل[۵۶] و الضحیٰ کی قسم اور مکھ کو مصحف اور صورت کو فجر سے مشابہ بتلاتے ہوئے والنجم کی قسم کھاتا ہے۔ علامہ جار اللہ زمخشری کی مشہور تفسیر "الکشاف" اسے اپنی تفسیرِ غم کے وقت یاد آجاتی ہے، امام فخر الدین رازی کی نکتہ سنجی کے فخر کو بے جا ٹھیراتا ہے مگر ایک غزل کا آغاز اس عربی مصرع سے کرتا ہے [۵۷]

قولوا أحبابنا فأين طريق

یہ سچ ہے کہ ولی کے یہاں عرب شعرا یا ان کے کلام کی طرف اشارے نہیں پائے جاتے پھر بھی ایک جگہ وہ قصیدہ لامیہ کے حفظ کرنے کا ذکر کرتا ہے، عربی زبان میں دو لامیہ قصیدے بہت مشہور ہیں ایک تو شنفری کا لامیۃ العرب اور دوسرا طغرائی کا لامیۃ العجم۔

ولی نے جس انداز سے اپنے کلام میں مکتب و کتاب، درس و تکرار، مدرسہ و معلم، تعلیم و تعلم، جزدان و رواق اور قیل و قال کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی بنا پر اگر ہم یہ قیاس

---

[۵۱] کلیاتِ ولی ص۱۵۸، [۵۲] ص۲۶۲، [۵۳] ص۳۶۰، [۵۴] ص۳۴۲، [۵۵] ص۳۶۱، [۵۶] ص۲۹

[۵۷] ضمیمہ ص۲۴۷

کریں کہ اسے مکتب و مدرسے سے بہ حیثیت معلّم و متعلّم ضرور تعلّق رہا ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ فلسفہ، نجوم اور منطق کی اصطلاحیں وہ بے تکلفانہ طور پر استعمال کرتا ہے۔ جوہر فرد، ممتنع، نظری اور بدیہی[51] سے وہ پوری طرح واقف ہے، خلا کے محال[52] ہونے میں وہ فلاسفہ کا ہم نوا ہے اسی طرح بخش[53] اکبر فلک کے اسد[54] اور قوس[55] تک بھی اس کی رسائی ہے۔ ایک جگہ اپنی آنکھ کو برج حوت سے تشبیہ دے کر اسے اپنے ماہ رُخ محبوب کی منزل قرار دیتا ہے۔

اسے خطاطی میں بھی اچھا خاصا درک حاصل ہے۔ ریحان، ثلث، لام نستعلیق اور کاف کوفی سے اچھی طرح واقف ہے۔ کاتبوں کے سرگروہ یاقوت المستعصمی کا ذکر اس کے یہاں بار بار آتا ہے ایک جگہ میر علی کا بھی ذکر کرتا ہے، اس نام کے دو کاتب مشہور رہے ہیں ایک تو میر علی تبریزی جو امیر تیمور کا ہم عصر ہے اور دوسرے میر علی ہروی جس نے خطاطی میں مولانا زین الدّین اور سلطان علی مشہدی سے فیض حاصل کیا تھا اور جسے ابو الفضل اپنی انشا کے دفترِ سوم میں "سر دفتر خوش نویسانِ نستعلیق" کہہ کر یاد کرتا ہے۔ فنِ خطاطی میں میر علی کے کمال کا اعتراف ولی کی ذات تک ہی محدود نہیں چنانچہ اس کا ہم عصر محمد افضل سرخوش جو تذکرۂ "کلمات الشعرا" کا مولف ہے اپنے دوست ناصر علی سرہندی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

با شعر علی نمی رسد شعر کسے　　　　زاں ساں کہ خط کس بہ خط میر علی

اس کے ہلال ابرو محبوب کی ابرو حسامی کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ جو اصولِ فقہ کی مشہور کتاب ہے جس کا اصلی نام "المنتخب فی اصول المذہب" ہے اور اپنے مصنّف حسام الدین اخسیکتی (متوفی ۶۴۴ھ) کے نام کی مناسبت سے الحسامی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ منطق کی مشہور کتاب "شرحِ شمسیہ" یا قطبی کا ذکر آشنائے فن کی حیثیت سے کرتا ہے، ولی

---

۵۱ کلیاتِ ولی صفحہ ۳۷، ۵۲ صفحہ ۲۵۰، ۵۳ صفحہ ۲۶۱، ۵۴ صفحہ ۱۲۸، ۵۵ صفحہ ۳۶۴

اپنے شاہد کے درس کے بعد قطبی اور منہل کے درس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ یہ منہل غالباً المنہل الصافی ہے جو نحو کی کتاب 'الوافی' کی ضخیم شرح ہے، اس شرح پر مولانا نور الدّین صدّیقی نے بھی حاشیہ لکھا ہے۔ اس شرح کے مصنّف بدر الدّین محمد بن ابی بکر دمامینی (متوفّی ۸۲۸ھ) ہیں جنھیں بانیٔ احمد آباد سلطان احمد شاہ کی فیّاضانہ سرپرستی کشاں کشاں مصر سے گجرات میں لائی جہاں ۸۲۰ھ میں کھنبایت میں انھوں نے ابنِ مالک کی کتاب 'تسہیل الفوائد' کی شرح 'تعلیق الفرائد' لکھ کر سلطان احمد شاہ کے نام پر معنون کی۔ اسی مصنّف نے ۸۲۴ھ میں نہروالہ پٹن میں ابنِ ہشام کی 'مغنی الاببیب' کی شرح تحفتہ الغریب فی الکلام علی مغنی اللبیب، کے نام سے تین جلدوں میں لکھی، المنہل الصافی، ۸۲۵ھ میں مہائم میں تالیف ہوئی اور اس کا مبیّضہ اسی سال مؤلّف نے احسن آباد یعنی گل برگہ میں تیار کیا، اس کتاب کا جو نسخہ مکتوبہ ۹۹۳ھ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے اس کے کاتب شاہ علی جیو گام دھنی کے پوتے سیّد ابراہیم ہیں۔

طب اور الٰہیات میں بوعلی ابن سینا کی 'قانون' اور 'شفا' سے بھی واقف ہے۔ علمِ حساب میں 'لیلاوتی' ایک مختصر سی کتاب ہے جسے فیضی نے سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا تھا اور جس کے دیباچے میں وہ اپنی اکبر پرستی کا یوں ثبوت دیتا ہے ع

اکبر بہ شناس تا خدا بہ شناسی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی ہمارے شاعر کے مطالعے میں رہی ہے، ایک اور جگہ فائدہ فواد کا ذکر اس کے یہاں پایا جاتا ہے، کوئی تعجب نہ ہوگا اگر شاعر کا یہاں اشارہ حضرت نظام الدّین اولیا دہلوی کے ملفوظات کے اس مجموعے کی طرف ہو جسے ان کے مریدِ باصفا اور مشہور شاعر خواجہ حسن سجزیؒ نے مرتّب کیا ہے اور جس کا نام 'فوائد الفواد' ہے شیخ شہاب الدّین سہروردی مقتول کی 'حکمتہ الاشراق' سے بھی اگرچہ ہمارا شاعر نا واقف نہیں لیکن جس خاص علم سے اسے والہانہ شیفتگی ہے وہ معانی اور

بیان کا علم ہے۔ شاید ولی کی مرغوب ترین کتابیں 'مختصر المعانی' اور 'مطول' رہی ہیں، یہ دونوں 'تلخیص المفتاح' کی مشہور شرحیں ہیں جن کے مصنف علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی (متوفی ۷۹۲ھ) ہیں۔ 'مطول' کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس پر کئی حاشیے لکھے گئے۔ 'تلخیص' کا موضوع علمِ معانی، بیان اور بدیع ہے۔ ولی مختصر و مطول کا ذکر بار بار اور مختلف پیرایوں میں کرتا ہے۔

اسے ولی اس خط کا حاشیہ اگرچہ مختصر ہے لیکن مطول کے معانی کا پورا مدعا اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہر شب معشوق کی زلف سے مطول کی بحث جاری تھی لیکن اس کے دہن کو دیکھ کر سخن مختصر کرنا پڑا۔ محبوب کی زبان سے جو علمِ معانی کا بیان سنا تو عاشق نے مطول کا پڑھنا مختصر کر دیا۔ سعد الدین (تفتازانی) کا اصلی مقصد زلفِ بدیعی کا بیان ہے تعجب ہے کہ ابھی تک لوگ مطول کے معانی کو نہیں سمجھے۔

ولی کا معشوق کی زلف کو 'مطول' کی درازی سے اور اس کے دہن کی تنگی کو مختصر سے بار بار تشبیہ دینا ظاہر کرتا ہے کہ یہ کتابیں اکثر اس کے زیرِ مطالعہ رہی ہیں۔ 'تلخیص' کی ایک اور شرح ہے جو 'مطول' سے بھی زیادہ مفصل ہونے کے باعث 'اطول' کہلاتی ہے ہمارا شاعر واقف ہے، اس کے مصنف ابراہیم بن محمد بن عرب شاہ اسفرائنی متوفی ۹۴۳ھ ہیں۔

'کلیاتِ ولی' میں مختلف علوم کی کتابوں کا جس انداز میں ذکر کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ولی کے علمی میلانات کیا تھے اور اس کی علمی استعداد کس درجے کی تھی۔ کیا کوئی شخص جس نے 'کلیاتِ ولی' کا مطالعہ بہ امعانِ نظر کیا ہو ولی پر کم علمی کی تہمت گوارا کر سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ احسن مرحوم کو تشکک اور تذبذب کے باوجود تذکرہ 'محبوب الزمن' کے مولف کے اس بیان سے اتفاق کرنا پڑا کہ ولی نے مدرسۂ احمد آباد گجرات میں ضرور تحصیلِ علوم کی اور بہ قدرِ ضرورت تمام مروجہ فنون میں کافی دستگاہ بہم پہنچائی۔

شمس العلما آزاد اور مولوی احسن مارہروی دونوں نے 'نور المعرفت' کا ذکر کیا

ہے نگر ان میں سے ایک کو بھی اس کتاب کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، آزاد اور ان کی تقلید میں احسن اس کتاب کا موضوع تصوّف اور سلوک بتاتے ہیں حالانکہ اس مختصر سے رسالے کو تصوّف سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ مولانا نورالدّین صدّیقی کے شاگرد اور مرید محمد اکرم الدّین مخاطب بہ شیخ الاسلام خاں صدر صوبہ نے جو کہ مولانا طاہر پٹنی کی اولاد میں سے تھا اپنے اُستاد کے لئے بہت بڑی لاگت سے احمد آباد میں ایک شان دار مدرسہ تعمیر کرایا، اس مدرسے کا سنگِ بنیاد ۱۱۰۲ ہجری میں رکھا گیا لیکن اس کی عمارت کی تکمیل ۱۱۰۹ ہجری میں ہوئی جس کی تاریخ "ھو المسجدُ اُسِّسَ علی التقویٰ من اوّل یوم" سے نکلتی ہے، باقی عمارات ۱۱۱۱ ہجری میں مکمل ہوئیں "مدرسۃ فیہا الھدیٰ للعالمین" ان کا تاریخی مادّہ ہے یہ وسیع اور شان دار مدرسہ جس کے فیض سے ہزاروں تشنگانِ علم سیراب ہوئے آج خود عبرت کی ایک دردناک داستان بنا ہوا ہے۔ ولی نے اپنا رسالہ "نورالمعرفت"[۱۱] اسی مدرسہ ہدایت بخش کی تعریف اور مولانا نورالدّین صدّیقی اور ان کے صاحبزادے کی مدح میں لکھا ہے۔ اس مختصر رسالے سے جہاں ولی کے انشاپردازانہ کمال کا سراغ ملتا ہے اس کے تحصیلِ علم کا حال بھی آشکار ہو جاتا ہے اور علوم متداولہ میں اس کی دسترس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

---

[۱۱] راقم نے رسالہ نورالمعرفت مختصر سے دیباچہ کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

ولی اور اردو زبان

زبان اپنے زمانہ کی سچی رفیق ہوتی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں جو تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے زبان اس کا اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رجحان بدلتے ہیں، ذہنیتوں میں تغیر آجاتا ہے اور اس طرح ایک ذہنی انقلاب رونما ہوتا ہے اس انقلاب کا اثر زبان کے آئینہ میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور ذہن و فکر کی یہ تبدیلی ادبی انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ غرض زبان و ادب کا یہ فعل و عمل اس کی بقا و ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر زبان ایسے انقلابات سے اپنا دامن بچا کے رکھے تو وہ اپنے لئے ترقی کے بہت سے دروازے بند کر دیتی ہے۔

اسی قانون کے تحت اردو بھی اپنے آغاز سے ایسے کئی دوروں سے گذر چکی ہے آج ہم اسے ایسی ترقی یافتہ شکل میں پا رہے ہیں کہ اس کے ابتدائی دور میں اسے دیکھ کر کچھ دیر کے لئے حیران سے رہ جاتے ہیں۔ زبان و ادب کے ہر دور میں کچھ ایسے مصلح و پیشوا پیدا ہوتے ہیں جو ذوق سلیم رکھنے کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے نبض مزاج شناس بھی ہوتے ہیں۔ زبان کے تیئں محسن جدت و تازگی پیدا کرتے ہیں اور اس کو مقتضائے زمانہ کے مطابق صحیح راستہ پر لاتے ہیں۔ ایسے ہی مصلحین و مجتہدین میں ولی کا بھی شمار ہے۔ ہمیں اس کی ادبی و لسانی خدمات اور اس کے اجتہادات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اس سے پہلے کی زبان و ادب کا جائزہ لینا چاہئے۔

اردو زبان کسی علاقہ میں پیدا ہوئی ہو اس سے اس وقت بحث نہیں لیکن سب سے پہلے اس کی ادبی تشکیل یقیناً گجرات و دکن میں ہوئی ہے۔ گجرات و دکن کے سازگار ماحول میں اردو نے نشو و نما پائی جو ہر لحاظ سے مستحق ستائش ہے۔ اس فضا میں اردو اتنی پھلی پھولی کہ نویں صدی کے اوائل سے گیارھویں صدی کے اواخر تک اردو ادب نے اپنے دو

ارتقائی مدارج طے کر لئے۔

لسانی پہلو کے پیشِ نظر اردو کا پہلا دور تخمیناً ۸۰۰ھ سے ۱۰۰۰ھ تک متعین کیا جا سکتا ہے اب تک کی تلاش و تفتیش کے مطابق گجرات و دکن میں یہ دور صوفیائے کرام کی ادبی خدمات سے تعلق رکھتا ہے۔ گجرات میں اس دور کے ممتاز نمائندے شیخ بہاؤ الدین باجن متوفی ۹۱۲ھ قاضی محمود دریائی متوفی ۹۴۳ھ (ان کے کلام کا مجموعہ چکریاں کہلاتا ہے) علی جیو گام دھنی متوفی ۹۷۳ھ مصنف جواہر اسرار اللہ اور خوب محمد چشتی متوفی ۱۰۲۳ھ مصنف خوب ترنگ، چھند چھنداں اور بھاؤ بھید ہیں۔ دکن میں سید محمد حسینی گیسو دراز متوفی ۸۲۵ھ میراں جی شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ مصنف خوش نغز، خوش نامہ اور رسالہ مرغوب القلب برہان الدین جانم متوفی ۹۹۰ھ مصنف وصیت الہادی، سکھ سہیلا اور بہمنی دور کا ایک غیر صوفی شاعر نظامی اس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

اگرچہ اس ابتدائی دور میں زبان محدود تھی تاہم اس کے ادب کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زبان ایک خاص ڈھرے پر آ چکی تھی۔ ان صوفیائے کرام کے کلام میں ایک قسم کی یکسانیت پائی جاتی ہے اور ان کے کلام میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ دقت ان کے موضوع تصوف کی وجہ سے بھی پیدا ہو گئی ہو۔ چوں کہ آج ہم قدیم زبانوں کی صرف و نحو اور لغات سے کماحقہ واقف نہیں ہیں اس لئے اس دور کے ادبی کارناموں کے سمجھنے میں بہت دقت محسوس ہوتی ہے۔ اس دور کے ادب کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ زبان میں مقامی الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں جیسے

جو یاں = دیکھے۔ سیری = کوچہ۔ لیکھے = سمجھے۔ دیٹھا = دیکھا۔ سادہ = آواز
آنوں = لاؤں وغیرہ

۲۔ فارسی محاوروں کا ترجمہ اسی دور سے شروع ہو گیا تھا۔

دپ کر = دفن کردن ۔ محبت داشتن = محبت کرنا یا رکھنا ۔ رقص کردن = رقصے ہو

۳۔ عربی فارسی الفاظ بھی کثرت سے استعمال کئے جاتے تھے ۔ چوں کہ سلوک و معرفت ان کے کلام کا موضوع ہے اس لئے مذہبی اصطلاحیں اکثر و بیشتر پائی جاتی ہیں ۔

۴۔ بعض فارسی الفاظ مقامی لب و لہجہ میں ادا کرتے ہیں ۔

نگہبان = نگھوان ۔ درست = درس ۔ غالیچہ = زلیچہ ۔ مسجد = مسیت

۵۔ بعض فارسی الفاظ جس طرح ادا کرتے اسی طرح لکھ دیتے جیسے ۔ نسخہ = نسخا ۔ راضی = رازی صحیح = صحی یا سہی ۔

بعض جگہ فارسی واو عطف کے بجائے ضمہ سے ہی کام نکال لیا ہے جیسے ارض و سما = ارضُ سما ۔

۶۔ اس دور کے کلام میں ضمائر گجراتی ہندی اور پراکرت کی بگڑی ہوئی شکلوں میں پائی جاتی ہیں ۔

ھوں = ہیں ، تمیں یا تھیں یا تمن = تم ۔ ہمن = ہم ۔ تمنا = تمھارا ۔

۷۔ الفاظ کی جمع دو طریقوں سے بناتے ہیں ایک برج کے مطابق جیسے ۔ درویش = درویشنہ

راتیں = راتنہ ۔ نین = نینہ ۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان یا یان بڑھا کر جمع بنا لیتے ہیں ۔

سیری = سیریاں ۔ آنکھ = آنکھیاں ۔ لوگ = لوگاں ۔

۸۔ جمع مضارع (کریں ، دھرین کے علاوہ برج کی ترکیب پر جاگیں = جاگنہ ۔ مانگیں = مانگنہ بھی بنا لیتے تھے ۔

۹۔ بعض جگہ (نے) کے لئے (سے) استعمال کرتے ہیں جیسے محمود نے = محمود سے ۔

۱۰۔ سے کے لئے تھی یا تھے (گجراتی) استعمال کرتے ہیں اسی طرح (جو) کے لئے گجراتی (جے)

استعمال ہوتا ہے

۱۱۔ بعض الفاظ اس طرح پائے جاتے ہیں۔

ہے = اہے۔ مجھ = منجہ۔ ہی = اِہی۔ جیب = جد۔ اب = ہب

۱۲۔ مستقبل کے لئے سی کا استعمال ہوتا ہے جیسے کرے گا = کرسی۔ جائیگا = جاسی۔ رہیگا = رہسی

غرض اس دور میں الفاظ کے سوا گرامر قریب ہندی ہے۔

۱۳۔ ساکن و متحرک اور تذکیر و تانیث کا خاص التزام نہیں پایا جاتا۔

اس دور کے کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:۔

باجن ہے ترے پنتھ کوئی چل نسکھے | جو چلے سو چل چل تھکے
پڑھ پنڈت پوتھی دہویاں | سب جان سدہ بدہ کھویاں
سب جوگیوں جوگ بسارے | سبہ تپئی تپ ہکارے
ایک درشنی درسن بھولی | سر ناگے پانوہ کھلے
ایک سیوری ہوے سیوکرنہ | ہوئی بپتی کیا دکہ دھرنہ
ایک درویش ہوئیکر آئے | ہوی قلندر روپ بھرائے
ایک ابدال ہوئے اب دھوتی | ایک باندہ اہا ہوتی
ایک راتی ماتی ہوے اررا ونہ | (بن) پی پیے سدہ ہو ہو جاونہ
ایک چنگم جٹا دھاری | ہور ہندو نس اندھیاری
ایک کاپری ہوی کر کنیہ | منہ سیو سجھے چنپہ
ایک اپاسی راتنہ جاگنہ | ہوے بھکاری تجھے مانگنہ
یوں ٹولی ٹولی ہوے کرے | سبہ رل رل کہل کہل کہوی کرے

دے مکت منے ایوے دیکھے　　آرے باجن تو کس سیکھے [۱]

محمود دریائی

جا پوچھو پیو کس ٹھانان　　میں پیو منہ پیو مجہ ماہناں
دو دماشہ گھی جو انہاں　　یو پیو جیو من ماہناں
جی کو تن اپنا لے تاوے　　اس پرکت پیو دکھلاوے
کچھ پیو تہیں الگا نہیں　　مجھ لیکھن یوں من ماہیں
جی کو مرم سو دھا پاوے　　سب الجھن اس کی جاوے
قاضی محمود اتنا مانے　　میٹھی پیو کوں الگا نجانے
بہت بات ایک آکھی　　وی جھوٹ نہیں چکہ ساجی [۲]

علی جیو:-

مکاشفہ

نکتہ اول۔ آپیں کھیلوں آپ کھلاؤں　　آپیں اپس لیکل آؤں
" دوم۔ میرا ناؤں منجے اتی بھاوے　　میرا جیو منجی پر جاوے
میری نیہ منجے سوں..... (؟)　　دھری اپنیں روپ لبھائے
" سوم۔ لاگا نیہ سو منجہ سوں میٹھا　　جد کا سو دھن اپس دیٹھا
جیکو اپین روپ لبھاوے　　سہی سو کیوں نہ آپ سہاروے
" چہارم۔ میں منجہ دھریا نو سنگہا تھے　　شاہ علی جیو ہے منجہ سا تھے
منجہ بن کوئی نہیں حکما ہناں　　جیری سہاگن ہوں تس نا ہناں [۳]

---

[۱] اورنٹیل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۳۰ء [۲] مجموعہ کلام ملوکہ جناب سید کالو میاں مشہدی [۳] مخطوطہ کتب خانہ پیر محمد شاہ۔ احمد آباد۔

خوب محمد چشتی۔

حکایت مرتبہ خلافت

جیوں محمود سو تہاں سلطان	عبد ایاز تخت فرمان
اس پر حکم کیا کہ آج	ہوں بندا توں بیس سوراج
تخت ایاز سو بیٹھا جای	سوی کرے جی وہ فرمای
چل محمود دین کیا سلام	کہیا کہ ھوں تجہ آج غلام
حاکم بھی محمود سو سب	جب سلطان عبد بھی جب
جد محمود عبد کی شان	عشق کہے پورا سلطان
تخت ایاز سو بیٹھا جانہ	حاکم نت محمود اوس ٹھانہ
حکم اس پر کیا جب	تخت بیس جا بیٹھا تب
انہیں قبولیا حکم تمام	تخت بیٹھیں ھوا غلام
حکم سو حاکم کا اس ٹھانہ	ہے محکوم غلامی مانہ
حاکم شخص سو ہے معبود	چھانہ محکوم ہوئی مسجود
ایہا خلافت پائی تمام	ہوئی سلطان جو عین غلام[1]

دوسرا دور ۱۰۰۰ھ سے شروع ہو کر ۱۱۰۰ھ پر ختم ہوتا ہے۔ اردو کا یہ دور سنہری دور تھا۔ شاہان دکن نے اردو کی جو سرپرستی کی ہے اس کے لئے اردو ان کی مرہون منت ہے۔ چوں کہ خود سلاطین زبان کے دلدادہ تھے اہل کمال نے بھی اردو کو بنانے سنوارنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ زبان نے امیروں کے دربار میں باریاب ہوتے ہی اپنا

---

[1] مخطوطۂ کتب خانہ پیر محمد شاہ۔ احمد آباد۔

رنگ روپ بدلا اور خوب نکھرنے لگی۔ اس میں نسبتاً صفائی پیدا ہو گئی۔ زبان کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ مذہب کے علاوہ اس زبان میں ہر قسم کے خیالات ادا کئے جانے لگے۔ عیش و عشرت کا زمانہ تھا بزمیہ مثنویاں بے شمار لکھی گئیں۔ وجہی نصرتی ابن نشاطی اور دوسروں نے مثنوی میں اعلیٰ معیار قائم کر دیا۔ صوفی منشوں نے مذہبی مثنویاں لکھنے میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ جنگ کا بھی ایک آدھ موقع پیش آیا تو رزمیہ مثنوی بھی لکھی گئی۔ درباروں کی وجہ سے قصائد بھی لکھے گئے۔ سلاطین کا رجحان شیعیت کی طرف تھا اس لئے مجالس عزا قائم تھیں مرثیے بھی لکھے گئے۔ صنف غزل خصوصاً سلاطین کے لئے مرکز توجہ رہی۔ وجہی نے سب رس لکھ کر نثر میں بھی اعلیٰ معیار قائم کر دیا۔ غرض اس دور میں اردو نے بہت ترقی کی اور ادب میں ایک قابل قدر ذخیرہ جمع ہو گیا۔

اس زمانہ میں ابتدائی دور کی چند خصوصیات قائم رہیں اور چند بدل گئیں۔ ولی کے کلام کی بھی یہی خصوصیات ہیں،

اس دور کے کلام کی خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ اردو مقامی زبانوں یعنی گجراتی۔ مرہٹی تلنگی وغیرہ سے اتنی متاثر ہوئی کہ ان زبانوں کے بے شمار الفاظ اس میں شامل ہو گئے اگرچہ ابتدائی دور میں بھی مقامی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں مگر اس دور میں ان کی تعداد کافی زیادہ ہے۔

۲۔ لفظ کی درمیانی (و) (ی) اور (الف) کو تلفظ میں گرا دیتے ہیں جیسے مانند = مند۔ نزدیک یا نزیک = نزک۔ میٹھا = مٹھا۔ پھیکا = پھکا۔ دیوانہ = دونہ۔ پیچھے = پچھے۔ سوکھا = سکا۔

۳۔ حرف حصر کی ہ حذف کر دی جاتی ہے جیسے تمہیں = تمی۔ وہی = وی۔ [illegible]

بڑھا دیتے ہیں جیسے وہی سے ووہی۔ تیج۔ ایسا ج۔ گجرات میں چ کے بجائے ج بڑھاتے ہیں جیسے ایساج۔ اس ہی = اسیج۔ گجراتی زبان میں بھی یہی کیا جاتا ہے۔

۴۔ مصدر کے آخر میں (ی) بڑھاتے ہیں جیسے اختیار سے اختیاری۔ انتظار سے انتظاری۔ یادگار سے یادگاری۔

۵۔ کرکر بمعنی کر کے عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے

۱۔	اے شوخ تجھ نین میں دیکھا نگاہ کر کر	عاشق کے مارنے کا انداز ہے سراپا
۲۔	جب اس کی طرف جاتا ہوں کر قصد تماشا	کہتا ہے مجھے خوف رقیباں سوں کہ جا جا
۳۔	مندسے واسوں باہر کر اپس کے آپ منصف ہو	نکالا تیوجھ بک کرا تا بیزار کرنا کیا
۴۔	تر سے مکھ کے چمن کوں یاد کر کر	دیا لالے نے اپنے دل اپر گل

۶۔ ضمائر اس طرح استعمال ہوتے ہیں:۔

ان کا = انہوں کا۔ جھنوں کا۔ کنھوں کا۔ مجھ = میرا۔ تجھ = تیرا۔ گجراتی ضمیر ہوں بمعنی میں نہیں پایا جاتا مگر تیں = تو۔ تمیں، تجے۔ تم۔ ہمن۔ تمن۔ تمنا پائے جاتے ہیں۔

۷۔ فعل میں صیغہ جمع مونث میں (ان) لگاتے ہیں جیسے کھائیں = کھائیاں۔ آئیں = آئیاں۔ جاتیں = جاتیاں وغیرہ

۸۔ فعل متعدی کے ساتھ (نے) نہیں لاتے تھے جیسے میں نے کھایا کو میں کھایا کہتے تھے۔

۹۔ کنے۔ پاس۔ آگے کے قبل (کے) نہیں لاتے ہیں۔

اس پاس = اس کے پاس۔ محبوب کنے = محبوب کے کنے۔ شہر آگے = شہر کے آگے۔

۱۰۔ کسی بات پر زور دینے کے لئے الفاظ مکرر لائے جاتے ہیں جیسے جنگل جنگل صحرا

ھرا قدیم اردو میں گجراتی کی ترکیب پر گھر گھر کے بجائے گھرے گھر۔ بال بال کے بجائے بالے بال کہا جاتا۔

۱۱۔ نون غنہ کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ جیسے تو کو توں۔ کو کو کوں۔ کوچہ کو کونچہ۔

۱۲۔ الفاظ کی جمع بنانے میں برج کا طریقہ مفقود ہو گیا (ان) لگا کر جمع بنا لیتے جیسے بات۔ باتاں لوگ۔ لوگاں۔

۱۳۔ تذکیر و تانیث اور ساکن و متحرک پہلے دور کے مطابق تھے۔

۱۴۔ واو عطف دو ہندی الفاظ کے درمیان۔ اور ہندی اور فارسی الفاظ کے درمیان استعمال کرتے جیسے ناز و چھب۔ نین و دل۔

۱۵۔ اضافت۔ ہندی اور فارسی الفاظ کے درمیان اضافت استعمال کرتے جیسے۔ نقشِ چرن۔ بیڑۂ پان۔ جامِ نین۔

۱۶۔ فارسی الفاظ اور ترکیبیں پہلے دور کی نسبت کئی گنا زیادہ ہو گئی تھیں۔

مذکورۂ بالا چند خصوصیات کو دیکھنے سے یہ معلوم ہو گا کہ دور اول سے یہ دور مختلف ضرور ہے لیکن تاہم وہی ہندی طرزِ تخئیل پایا جاتا ہے بندشیں اکھڑی اکھڑی سی ہیں ، ہندی اور فارسی کا دلکش امتزاج بھی نہیں ملتا۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم یہاں اس دور کی چند غزلیں پیش کرتے ہیں۔

دیوانہ شدن سیف الملوک

جو ساحد ہوا نیند سیں ہوشیار (۱) لگیا دیکھنے تیئں انکھیاں پسار

نظر میں پڑا شاہزادہ کہیں (۲) لگیا ڈھونڈنے حیران ہو ہر کہیں

سو پایا انہ صارے منے ایک کھٹار (۳) پڑیا تھا اکیلا دو دکھوں بے قرار

آنجھو انکھیاں میں تھے ڈھلتے اچھے (۴) ندیاں ہو کے دو دہرتی چلتے اچھے

نہ ذرہ خبر کچ اسے ذات کی (۵) نہ طاقت زباں کو ہے کچ بات کی

جتا ساعد اسکوں اچانے کوں جائے (۶) جتا پاؤں پڑ کر منانے کوں جائے

وتا آپس دکھلاسے بے ہوش کر (۷) نسے جاب چپ رہے فراموش کر

اٹھیا ساعد اس دیکھ کر تلملا (۸) لیا ہتیاں سوں کمر بیلا

(غواصی سیف الملوک بدیع الجمال ص ۳۶-۳۵)

غزل (۱۲)

تیرے ہونٹاں کے سقے میں تھے دل منجکوں دوا
میرے درداں کوں سدا تیری شفا تھے ہے شفا

نین جھلکار تری بجلی نمن جب جھمکی
دشت تھے منج شوق کا مینہ پڑ کہ ہوا سب ہی ہوا

پھول و پھل کھیت ہمارے کوں لگے ہیں سر تھے
نین و دل بحث اپس آپ میں کرتے ہیں بجا

کیا غرض تجکوں اے بحثاں سوں پلاسے ساقی
غم پچھیں عیش و خوشی کا ہے صفا ہور صفا

حسن تیرے کا کریں چاڑی نین آپ میں آپ
یک نین کیا بوجھا یک کیا دیکھیاں توں ان میں بچا

عشق بازی جو منگے کرنے ہونا صبر اسے
غم ندیاں اہلے تو کرنا ہے اسے صبر روا

وعظ تیرے سوں معانی بندھیا ہے دل یارب
کرو آمین نبی و علی سے اس کی دعا
(کلیات محمد قلی قطب شاہ ص۱۱)

غزل (۲۳۵)

چھبیلی ہے صورت ہمارے سجن کی
کیا پوتلی اس کہوں آپ نین کی

نہ دیکھیا پچھل اس سار صورت
سر اوڈوں سکتے ریب اپنے موہن کی

چندا سا دیکھیا کہ اس سرو قد پر
تو ہوتی ہے شرمندہ پتلی گگن کی

ترا حسن پھل بن کھے نازک دسے تو
نہ دیسے ترے انگے چھب کوئی بن کی

نین تیرے دو پھول نرگس سختے نریب
نزاکت ہے تج مکھ میں رنگین چمن کی

ترے زلف پھنداں میں دل عاشقاں کے
رہے ہیں سو عاشق ہو پیو کی نین کی

نبی صدقے قطبا سوں او پیو ملیا ہے
تو کیا کہہ سکوں بات اس مکھ سمن کی
(کلیات محمد قلی قطب شاہ ص۲۲۸)

کلام عبداللہ قطب شاہ

بول دل کشا عشرت محل مطبوع اُوتارا ہوا — جوتی زمیں کے پیٹ میں جیوں مشتری ارا ہوا
ہر طاق یاں خوش طرح کا دستا دریچا فرح کا — عاجز ہوا اس کی شرح کا جیواں سنیبارا ہوا
انکھیاں سوں چندر سورکے دیکھ آسماناں دور کے — عاشق ہیں اس کے نور کے کیا خوب یو ٹھارا ہوا
دیویں صفا دیوار سو لک نقش ٹھارے ٹھار سو — خوش بان یاں عطار سو فردوس کا ہارا ہوا
نازک اچنبا بے بدل لکھیں بہر پایا ایسا محل — باندیا نہ کوئی آخر اول جمشید یا دارا ہوا
جیوں پھول تازا بن منے جیوں پوتلی لوچن منے — تیوں آج اس دکھن منے یو محل اکثر سارا ہوا
صدقے نبی کے پایاں اس محل میانے ہر زماں — جم عبداللہ شہ تہ کماں ہو گی گھنارا ہوا

آج زہے بخت جو آئی سعادت کی رات — پیا نہ سوں میرے ملا غم تھے منج دے نجات
روپ پیا میرے لال کا آئے نہ تحریر میں — چاند عطارد اگر ہوویں قلم ہور دولت
اس کے قداں کی قسم کرنے سرو کوں خجل — باد اڑاتا پھرے چمنے چمن پات پات
صدقے نبی کے تیرے دل میں رہتا ہے مدام — چند ہو شاہ عبداللہ خسرو عالی صفات

(دکن میں اردو)

غزل گفتن محمد قلی قطب شاہ

بد عشق میں پیا سو پڑیا ہے اثر منجے — شاید عقل فہم چھپن کیا سب بے خبر منجے
دھن مکھ اگن میں پڑنے سمندر ہوا ہوں آج — طوطی نہیں ہوں میں کہ جو بھاوے شکر منجے
پھسلا کے خوبی سوں نخ لیجا تا ٹیلا سے کر — شانہ سے یو عشق آج کر دھر کا کدھر منجے
ہاتف خبر دے بیگ اگر دوست ہے مرا — کس رات آملے گی وہ چنچل سندر منجے

بادل ہو بادنا دپھروں دشت میں ۔ تا ل نا بھاوے سنگ جگ کسی کا نہ گھر منجے
ہاتف مجھے خبر دے اگر دوست ہے مرا کس رات آ لے گی وہ چنچل سندر منجے
اب بھاوتا ہوا ہوں سبھی بھاوتیاں کوں چھوڑ دھن بھاوتے وو کھینچ لے اپنے ادھر منجے

(قطب مشتری)

کلام شاہی

سارے جہاں کے پارکھی پرکھوں رتن کیوں کر کہو یاقوت ہور مرجان میں کو ہی رتن برتر کہو
بولے جہاں کے پارکھی ہمنا نہ آوے بولنا تماسہاتا بولنا اے شاہ بحر و بر کہو
بولیا ہوں نت میں نکرتے یو دو رتن کا فرق کر گر کچ اچھے انصاف تو اس بول کوں خوش تر کہو
مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے جس ذات میں صافی اچھے اس ذات کو بہتر کہو
یاقوت ہور مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل سن کر جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

(دکن میں اردو)

کلام نصرتی

چندر بدن کہیا تو کہی موں سنبھال بول سورج مکھی کہیا تو کہی یوں نہ گھال بول
دو نین بھی تجھ نہ کہیوں تو سکے تجھ کوں کہا کہنا کہی اس بہشت حسن کوں جم جگ اُجال بول
بولیا نشان ہے عشق کی ارادت کا قد ترا بولی کہ فوج فتنہ اوچانے کی ڈھال بول
بولیا رہنے منگے ترے مسں پھول کن ہلال بولی کہ بادلی میں ہے گئی تجھ سے نڈال بول
بولیا کہ تجھ فراق سے کی عاشقاں خراب بولی مرے وصل نے کیا تجھ سے حال بول
بولیا کہ کعبہ دل ہے تو دل توڑنا حرام بولی تباں کے ہت تھے تٹے تو ہلال بول
بولیا کہ لئے دنوں تھے تری بندگی میں ہوں بولی کہ خیر یو بچ کیتک ماہ و سال بول

(دکن میں اردو)

ولی کا قدیم رنگ

(۳۹)

تو اب ہے جو سینہ شاد دستا — مطلب ہے کہ بامراد دستا

تجھ مکھ کے صفحے پہ نقطۂ خال — سرمایۂ ہر مراد دستا

ہر نسخۂ لذت جہاں کا — انکھیاں میں تری سواد دستا

ابرو کے تری کہ یہ خال موزوں — خوش مصرع مستزاد دستا

تیری یہ جبین با صباحت — مجھ جلوۂ بامداد دستا

تجھ نین کی کیا کروں میں تعریف — یہ عین ثلث کا صاد دستا

عالم میں ولی سخن یو تیرا
مجھ فائدہ فواد دستا

(ص ۲۹)

(۵۴)

تیرے شکر لب کو اب مثل عسل بولنا — بلکہ عسل ہے نقل اس کوں اصل بولنا

تجھ قد و قامت اگے سرو ہوا سرنگوں — تجھ سے رواں سرو اگے سرو کو شل بولنا

مکھ کی صدف پر تری دُر ہے مبارک بچن — دُرِ سمندر اسے سب کی عقل بولنا

بات کی مجلس منیں میرا سخن تو تجھ سے ہے — جگ میں مسیحا تجھے جب سوں سبل بولنا

مور ضعیفا ہے ولی خاک قدم بھارا سے — بلکہ ضعیفی منیں بس نہیں بل بولنا

(ص ۳۹)

(۱۳۰)

شوخ نکلا جب قدم کو تیز کر ‏ ‏ ناز کے شبدیز کوں مہمیز کر
یک بہ یک آیا ادا سوں مجھ طرف ‏ ‏ ہر پلک کوں دشنۂ خوں ریز کر
میں کیا یوں عرض از روئے نیاز ‏ ‏ مہربانی اس کی دست آویز کر
کہہ اپس کی نرگس بیمار کوں ‏ ‏ عاشقاں کے خون سوں پرہیز کر
اے ولی آیا ہے وہ مقصود دل
خانۂ دل خوں سوں رنگ آمیز کر

(ص ۹۸)

(۱۹۹)

سجن تجھ انتظاری میں رہیں نس دن کھلی انکھیاں ‏ ‏ مثال شمع تیرے غم میں رو رو بہ چلی انکھیاں
ہوئی جیوں جلوہ گر تجھ یاد سوں مجھ دل میں بیتابی ‏ ‏ تپیں شعلہ نمن گرمی سوں غم کے تلملی انکھیاں
جدائی جب سوں ہوئی ظاہر تمہارا سوں تو تجھتا ہوں ‏ ‏ ترے بن تیل کے جیوں میل سرمے کی سلی انکھیاں
ترے بن رات دن پھرتا ہوں بن بن گشن کے مانند ‏ ‏ اپس کے کھ اپر رکھ کر نگہ کی بانسلی انکھیاں
ترک میرے کرم سوں تا کہ آوے بے حجاب ہو کر ‏ ‏ تماشے میں ترے جیوں آرسی ہیں صیقلی انکھیاں
تری نیناں پہ گر آ ہو تصدق ہو تو اچرج نہیں ‏ ‏ کہ ان کو دیکھ کر گلشن میں نرگس نے ملی انکھیاں
اتی خواہاں ہیں تجھ حسن و ملاحت و لطافت کی ‏ ‏ کہ گویا دل میں رکھتی ہیں سدا فکر ولی انکھیاں

(ص ۱۵۱)

(۲۹۵)

سجن تجھ بن ارم گلشن کوں گلشن کر نہیں گنتے ‏ ‏ بہ جز تیرے میرروشن کوں روشن کر نہیں گنتے

سکندر کیوں نہ جاوے بحر حیرت میں کہ مشتاقاں ‏ تمھارے مکھ اگے درپن کوں درپن کر نہیں گنتے

نہیں تیرے رقیباں سوں عداوت دل میں ہمنا کے ‏ مروت دوستاں دشمن کوں دشمن کر نہیں گنتے

اگر انجھواں کے گوہر سوں مکمل نیں ہوا دامن ‏ محبت مشرب اس دامن کوں دامن کر نہیں گنتے

ولی دل میں ہمارے حاسداں کا خوف نہیں ہرگز
بجز دزدی کسی رہزن کوں رہزن کر نہیں گنتے

(ص ۲۱۶)

چوں کہ ولی اسی دور سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کے کلام میں مذکورہ بالا تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہاں ولی کے کلام کی خصوصیات ذرا تفصیل سے بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ مصدر کے بعد 'ی' جیسے نسیاں سے نسیانی۔ خمار سے خماری۔ خلاص سے خلاصی۔ انتظار سے انتظاری۔

حافظے کا حسن دکھلاتا ہے نسیانی مجھے
خماری دیکھ تجھ انکھیاں کی بے کیف
خلاصی کیوں کہ پاوے بلبل دل
نہ کر تغافلی اے مصر حسن کے یوسف
شتابی آکہ جی تجھ پہ کروں اسپند اے ظالم

۲۔ ماضی کریا کے وزن پر۔ سنا = سنیا۔ پڑا = پڑیا۔

سنبل پڑیا ہے دام میں تجھ زلف کے اے گل بدن
آزاد سوں سنیا ہوں یہ مصرع مناسب
میں جیو کوں رکھیا عشق کے بازار میں لیکن

جس کے دیکھے ہوش نے باندھیا ہے رخت

۳۔ مجھ اور تجھ کا استعمال۔ مجھ = مجھے۔ مجھ شکستگی مجھ کو شکستگی مجھ آغوش میں میری آغوش میں وغیرہ

تجھ حسن کا جب سوں غلغلہ ہے

تجھ زلف کی شکن نے دیا مجھ شکستگی

جس وقت مجھ آغوش میں وہ سیم تن آوے

۴۔ ر اور ل کا تبادلہ۔ تلوار سے تروار۔ بانسری سے بانسلی

ہر نگاہ تیز اس کی تیر ہے تروار ہے

ہر استخواں میں میری آواز بانسلی ہے

۵۔ فعل فاعل کے مطابق۔ نظر کی کے بجائے نظر کیا۔

جب سوں ترے جمال پہ من نے نظر کیا

کیا ہوا توں کیا کتا بال جمع

دیا ہے لطف سوں تجھ کوں خدا نے حسن کی دولت

۶۔ ترکیب اضافی و توصیفی۔ مضاف اور مضاف الیہ ہندوستانی کے طریق پر۔ جیسے خط غلامی سے غلامی خط۔ توصیفی۔ مروت دوستاں۔ محبت مشرب۔ خیریت انجام وغیرہ۔

لکھ دیا یو سبٹ غلامی خط تجھے

مروت دوستاں دشمن کوں دشمن کر نہیں گنتے

محبت مشرب اس دامن کوں دامن کر نہیں گنتے

دسے شیشۂ لب سوں کدھی یک خیریت انجام جام

ہوش دشمن ہیں خوش ادا کے نین

۷۔ نے اور دوسرے محذوف الفاظ — میں نے اپنے دل کی بجائے — میں اپنے دل کی

مجنوں کی طرف کے بجائے مجنوں طرف۔

میں اپنے دل کی تجکوں حکایت نہیں لکھی۔

مشرب مجنوں طرف منسوب ہے

۸۔ مذکر و مونث۔ یاد، فکر بطور مذکر اور سیر بطور مونث۔

۹۔ جمع بطور واحد لانے کے بجائے جمع لانا جیسے گل دوڑیں = گلاں دوڑیں۔ داغ ہیں = داغاں ہیں وغیرہ۔

عجب نئیں گر گلاں دوڑیں پکڑ کر صورت قمری۔

یوں دوستاں کے ہجر سوں داغاں ہیں سینے پر ولی

۱۰۔ ہندی اور فارسی کے اجتماع سے اسم فاعل کی ترکیب۔

آہو پچھاڑ بہ معنی آہو پچھاڑنے والا۔

۱۱۔ بعض ہندوستانی اور فارسی لفظوں کی جمع کی صورت میں تبدیلی مثلاً

دل جلوں کا

ملامت عاشقوں پر

مجتمع چاروں طرف

۱۲۔ بعض حروف اور الفاظ کا حذف = مندرجہ ذیل الفاظ اس دور کے تمام شاعروں کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں ولی کے کلام سے چند ایسے الفاظ پیش کیے جاتے ہیں۔

سینے = سنے۔ پریت = پرت۔ پھیکا = پھکا۔ ٹوٹا بوریا = ٹٹا بوریا۔ نزدیک = نزک

صفحہ = صفے۔ جس کے عشق نے = جس عشق نے۔ دونوں = دنوں۔ ٹھاٹ = ٹھٹ

بچاٹ = چیٹ ۔ سورج ۔ سرج وغیرہ

۱۳۔ ایسے الفاظ جو اس دور میں مستعمل تھے جو بعد میں متروک ہو گئے۔

جدھاں = جب ۔ ہمن = ہم ۔ تمناکوں = تم کو ۔ دسے = دکھائی دے ۔ آپنے = اپنے ۔
ان نے = اس نے ۔ جن نے = جس نے ۔ کدھی = کبھی ۔ کتے = کتنے ۔ اتا = اتنا ۔
تلک = تک ۔ منیں = میں ۔ سیتی ۔ سیں = سے وغیرہ

۱۴۔ جمع بمعنی واحد جیسے حقوق بمعنی حق ۔ عشاق بمعنی عاشق ۔ اشراف بمعنی شریف

ہر طرف ہنگامۂ اجلاف ہے
مت کسو سوں مل اگر اشراف ہے

الٰہی عشق میں عشاق کر مجھ
اپس کا شوق کا مشتاق کر مجھ

لب ترے کا حقوق ہے مجھ پر
کیوں بھلاؤں میں دل سوں حق نمک

جمع الجمع کی بھی ایک مثال دیکھئے:۔

مشائخ ۔ مشائخاں

مشائخاں جو گئے ہیں مدام کسب شرف
تری جناب سے پائے ہیں قرب حقانی

۱۴۔ ضرب المثل

کیوں تکے ہو سیری حسن سوں تیرے
دھوپ کھانے سوں پیٹ بھرتا نہیں

ستم پہ ور رسوں دکھ کہنا کٹے پر لون لاتا ہے
نہ کہو سیرا سے جو کٹی نہ پوچھے سرپہ یا گگڑی

ولی ایک مصلح شاعر کی حیثیت سے پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ اس نے خود بھی اسی دوسرے دور کی زبان میں پہلے پہل غزلیں کہیں لیکن یہ اسلوب اس کے ذوق سلیم کو پسند نہ آیا۔ اس کی دور بین نگاہوں نے زبان و ادب کی مشکلات اور مقامی دشواریوں کو پالیا اور ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی جس میں اس کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔

ولی نے اپنے تخئیل کی جولانیوں کے لئے غزل کا میدان پسند کیا تھا۔ غزل کی ایک خاص زبان ہوتی ہے۔ اس میں لوچ دار الفاظ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے لب و لہجہ میں سوز و گداز ہوتا ہے۔ الفاظ شیرینی کے ساتھ موسیقیت بھی لئے ہوئے ہوتے ہیں غرض زبان کو غزل کے موضوع سے خاص لگاؤ ہوتا ہے اور اس میں جہاں فرق آیا اچھے سے اچھا خیال خاک میں مل جاتا ہے۔ شاہان دکن کے کلیات دیکھ کر ہی ولی نے یہ کمی محسوس کی ہوگی اس لئے اس نے اپنی قابلیت، استعداد اور ذوق کی مدد سے زبان کے معاملہ میں اجتہاد سے کام لیا۔

ولی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستانی عنصر کے ساتھ ساتھ فارسی کے ذخیرہ سے بھی بہت فائدہ اٹھایا۔ فارسی الفاظ اور محاوروں کا اضافہ ہر دور کی خصوصیت ہے مگر اس میدان میں ولی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ ولی نے بے شمار فارسی محاورے اردو میں ترجمہ کرکے اس طرح استعمال کئے کہ اردو سے انھیں کبھی جدا نہیں سمجھا گیا۔ ولی نے اسی طرح فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو بھی اردو میں روشناس کرایا۔ ان الفاظ اور ترکیبوں کی وجہ سے غزل میں جان پڑ گئی۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم یہاں ولی کے اجتہاد کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) فارسی لغات اور محاوروں کے ترجمہ پر مفصل مضمون اس کتاب میں شامل ہے اس لئے یہاں چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

تیغ افشاندن = تیغ جھاڑنا

تیغ ابرو کی جب وہ جھاڑا ہے

طرز کسی گرفتن = طرز لینا

کیوں نہ لیویں زاہداں تجھ دیکھ طرز برہمن

گوشہ گرفتن = گوشہ پکڑنا۔ جس نے پکڑا گوشۂ آزادگی

آہنگ چیزے داشتن = آہنگ رکھنا

اے بوالہوس نہ دل میں رکھ آہنگ عاشقی

ارزانی باد = ارزانی ہونا

کام گرفتن = کام پانا

راز طشت از بام شدن = راز پڑا بام پر سوں طشت

طشت از بام ہونا

مجھ راز دل کا آج پڑا بام پر سوں طشت

ہراس گرفتن = ہراس پکڑنا

۲ ولی کے کلام میں فارسی کی دل کش اور خوبصورت ترکیبیں بھی ملتی ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتے ہیں۔

گل داغ الم، خزاں خاطر عاشق، گوہر کان حیا، باعث جمعیت ایام جوانی۔ مینائے شراب بزم حسن، نشۂ سبزی خط خوباں، یوسف کنعان دل، سامان طغرائے نیاز، مُہر فرمان وفاداری، شمع بزم اہل معنی، رشک ہزاراں گل، مجنوں لیلیٰ حسن، داغ بخش سینہ و دل، مطرب نغمہ ساز محفل عشق، مورد انوار الٰہی، بہار گلشن خوبی، گوہر بحر نکتہ دانی، گل بہار دل، مصرع زنجیر جنوں، لذت دشنام، بہار کرم، حیرت آب، خضر رنگ، خم نیلی، گرم نگاہی، صفحۂ سیما، پردۂ بینا، موج بے تابی دل، سبزہ زار خموشی جنت احباب تمنا، نرگستان حیا، صفحۂ سینہ، موج آب یاقوت، موج آب وفا، حصار خاموشی سنبل خیز۔

ان میں سے چند کا محل استعمال بھی ملاحظہ فرمائیے۔

چمن میں جلوہ گر جب وہ گل رنگیں ادا ہووے	خزاں خاطرِ عاشق بہار مدعا ہووے
مثل مینائے شرابِ بزمِ حسن	حوض دل تجھ عکس سوں روشن ہوا
نشۂ سبزیٔ خطِ خوباں	والیٔ عالم خیال ہوا
صنم کے لعل پر وقتِ تکلم	رگ یاقوت ہے موجِ تبسم
اشک خوں آلود ہے سامان طغرائے نیاز	مہر فرمانِ وفاداری ہے داغ عاشقی

ولی اس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی	مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

اے عزیزاں سیر گلشن ہے گل داغ الم	صحبت احباب ہے معنی میں باغ زندگی

مطرب نغمہ ساز محفل عشق	تان گاتا نہیں ہزار افسوس

تجھ بن اے داغ بخش سینہ و دل	چمن لالہ دشت آتش ہے

فارسی اور عربی الفاظ میں تصرفات پہلے دور سے پائے جاتے ہیں۔ یہاں ولی کے کلام سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

جزورسی سے جزرسی

ہے کُل عالم پر کرم میرے اُپر	جزرسی ہے اجزرسی ہے جزرسی

حرکّت = حرکت

حرکّت جو اس کان میں در کے دیکھ	دل عاشق کے مانند پارا ہے

فجُر ۔ فجَر

فجر کے وقت گر دلبر چلے حمام کی جانب — تو جیوں سورج ہر اک کے دل سوں یک چشمہ گرم نکلے

گرم ۔ گرم

دارالحُرب ۔ دارالحَرب

کاں لگ بیاں کروں میں تجھ لعل لب کی شوخی — جس کن ہے موے سوں کم دارالحرب کی شوخی

زہَر ۔ زہُر

ترک لذت کی جس کوں ہے لذت — شکر اس کوں زہر، زہر شکر

جنّات عدن ۔ جنّاعدَن

سخن تجھ گل بدن کا آج نئیں ثانی چمن بھیتر — غلط بولا چمن کیا بلکہ جنات عدن بھیتر

زلف ۔ زلَف

بنائی ہے جہاں میں لیلۃ القدر — سیاہی تجھ زُلف کی دام لے کر

ختم ۔ ختَم

نپٹ تغافلی کوں نہ ست اس پہ دم بدم — تیری صفت کے بیچ جو کرتا ولی ختم

اظہر ۔ اظہر تر

بات نہ شمس میں ہے اظہر تر — حسن کا تخت و تاج ہے تجھ سر

شرم ۔ شرَم

وصف گری ۔ وصف گیری

ولی غمگیں نہ ہو یہ بھید اسرار الٰہی ہے — کہ تیری وصف گیری پر نگاہ دل ربا حافظ

اسی طرح تَن کو تَمن اور مَرض کو مَرَض استعمال کیا ہے۔

(۳) صرف فارسی ترکیبوں پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ ہندی اور فارسی کے شیریں اور لوچدار الفاظ سے مرکبات بنائے ہیں جو شمالی ہند میں متروک ہو گئے۔

شیریں بچن۔ خوش بچن۔ خوش باس۔ نور نین۔ آہو نین۔ امرت بچن۔ بچن مبارک۔

اشعار

۱۔ اگر ہو جلوہ گر بازار میں شیریں بچن میرا ۔۔۔ لگے پھیکی نظر میں اے ولی دوکان حلوائی

۲۔ افسوس وہ گلدستۂ خوش باس نہ آیا ۔۔۔ بلبل کی غلط نالہ و زاری میں ہوں بس دن

۳۔ وہ نور نین حیف مرے پاس نہ آیا ۔۔۔ یو بات ولی دل کی سیاہی سوں لکھا ہوں

۴۔ در سمندر اسے سب کی عقل بولنا ۔۔۔ مکھ کی صدف پر تیری در ہے مبارک بچن

(۴) کس خوبی سے ہندی (अन [illegible]) یعنی (نہیں)، عربی کے (لا) کی جگہ پر استعمال کرتا ہے اور لاینحل سے انحل اور لاحل بنا لیا۔ اسی طرح نیند سے انیندی انکھوں کی ترکیب بھی غور طلب ہے۔ دھڑ کنا کو (نہ) بطور لاحقہ لگا کر ندھڑک بمعنی نہ ڈرنے والا بنا لیا۔

ہر جنس کا معمّا بوجھا گیا ہے لیکن ۔۔۔ تجھ راز کا معما جگ میں رہا ہے لاحل

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا وہ زبان میں ولی کی جدّت سے تعلق رکھتا ہے ولی نے صنف غزل میں بھی پہلے والوں کے کلام کے مقابلہ میں بڑی جدّت سے کام لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ غزل کا طرز بدل گیا اور اس میں تازگی پیدا ہو گئی۔ ولی نے طویل اور خفیف دونوں بحروں میں غزلیں کہی ہیں، اگرچہ بحر خفیف میں ولی کی [illegible] اور بے شمار ہیں مگر بحر طویل میں بھی اس نے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے [illegible]۔

تجھ برہ کی آتش منیں دل جل انگارا ہوا ۔۔۔ اس کے اپر جلنے کوں جیو جیوں عنبر سارا ہوا

تجھ مکھ کے مصحف کے بھتر آیت جو دیکھی قہر کی — ہیبت سوں جیوں زیر و زبر دل ٹوٹ ہی پارا ہوا
فرہاد کے تیشہ سا مجھ اثر کا ہوا ہے غم ترا — ہر آہ دل کو چیرنے سینے بھتر آرا ہوا
گلشن منیں اس خلق کے وہ مکھ ہے تیرا رشک گل — شبنم عرق جس سوں اٹھا افلاک کا تارا ہوا
مجھ نین کے یعقوب کی نظارہ بازی پیر تھی — یوسف کے دیکھے سوں جوان پھر آج نظارا ہوا
مارا ہے جس کو اے صنم وہ رات دن تجھ پاس ہے — دامن کو لپٹا گرد ہو تجھ راہ کا مارا ہوا

غافل نہ رہ اے سنگ دل ہرگز ولی کے حال سوں
جس آہ کی آتش کوں سن خارا کا دل پارا ہوا

(کلیات ولی ص۲۰)

سورج ہے شعلہ تری اگن کا جو جا فلک پر جھلک لیا ہے
نمک نے اپنے نمک کو کھو کر نمک سوں تیرے نمک لیا ہے

یہ در سوں تیرے جو نور چمکا سو اس سوں تارے ہوئے منور
یو چاند تجھ حسن کا جو نکلا فلک نے تجھ سوں اچک لیا ہے

ترے درس کا یہ نور انور جدھاں سوں روشن ہوا ہے جگ میں
ندھاں سوں بجلی نے اس چمک سوں اپس چمک میں چمک لیا ہے

ترے شکر لب کی کیا ثنا کہوں کہ لعل جگ میں ہوا معزز
ترے لباں کی یہ دیکھ سرخی سو اس نے رنگ و دنک لیا ہے

جو کھول لٹ کوں چلا لٹک کر جھمک جھمک کر جو منہ دکھایا
سو لٹ کوں دیکھے ولی لٹک کر سجن نین میں اٹک لیا ہے

(دیوان ولی ص۲۵۵)

۴۔ مشکل زمین میں غزل کہنا انشا و جرأت کے دور کی خاص خصوصیت رہی ہے لیکن
ولی کے یہاں کبھی یہ چیز بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

مشکل قافیہ۔

تجھ گھٹ میں اے نگر گھٹ ہے شوق تجھ گھونگھٹ کا
دیکھیں سوں لٹ گیا دل تیری زلف کا لٹکا

کر یاد تجھ کپٹ کوں پڑتے ہیں اشک ٹپ ٹپ
کچھ بات بولتا ہوں شکوہ تری کپٹ کا

تجھ نین دیکھنے کو دل ہٹ ٹھٹھ کر چکا تھا
غمزے کے دیکھ ہٹ کوں ناچار ہو کے ٹھٹکا

تجھ خط کے بن تو جب کھلتا ہے اس کا مشکل
حلقے میں تجھ زلف کے جو جیو جا کے اٹکا

ہرگز ولی کسی کن شا کی ترا نہ ہوتا
گر تجھ میں اے سجن ہوتا نہ طور چھٹکا ۱۹

نہ پوچھو خود بخود موہن میں اڑ ہے — رقیب رو سیہ فتنے کی جڑ ہے
ہر اک زلفاں کے دیکھے نہیں اٹکتا — اٹکتا ہوں جہاں دل کی پکڑ ہے
کروں یوں سنگ دل کے دل کوں تسخیر — زبردستی میں لے جا کا گڑ ہے
نہیں بلدار جیسا سر پہ اس کے — عزیزاں تو جدائی کی اکڑ ہے
برستا ہے سجن کے کوہ اپر نور — تکتا بولنا تو ہر اک بات سوں جھڑ ہے

عجب تیزی ہے تجھ پلکاں میں اے شوخ — دو عالم اس دو دھارے سوں دو دھڑ ہے
شکست جوگی ہوا ہے دیکھ تجھ کوں — سرج جوگی فلک جوگی کی مڑھ ہے
کسی کی بات پر رکھتا نہیں گوش — سٹیلے ہٹ بھرے میں سخت اڑ ہے
ولی تو بحر معنی کا ہے غواص — ہر اک مصرع ترا موتی کی لڑ ہے

(ص ۲۶۰)

اس کے نین سوں غمزۂ آہو پچھاڑ ہے — اے دل سمجھ کے چل کہ آگے مار دھاڑ ہے
[illegible] کے چمن میں کیوں آسکوں میاں — خاراں کے جھاڑ خنجر مژگاں کی باڑ ہے
جن کوں نہیں ہے بوجھ ترے حسنِ پاک کی — تنکا نزیک تن کے مثال پہاڑ ہے
نرگس کا پھول بن کے کرے سیر دم بہ دم — جو تجھ نگاہِ مست کا کیفی کراڑ ہے
دل میں رکھا جدھاں سوں ولی تجھ دہن کی یاد — وا ڑم تن تدھاں سوں سینے میں دراڑ ہے

(ص ۲۶۱)

عجب معشوق لڑکا مرہٹا ہے — مٹھائی قند شکر سوں مٹھا ہے
سجن ہے سانولا سج کا سجیلا — کٹیلا اور ہٹیلا لٹ پٹا ہے
سدا طالب دل اپنا وارتا ہے — بجشوہ سر اوپر راو بٹھا ہے

غرض ولی نے اپنے اجتہاد سے زبان میں وسعت پیدا کر دی اور صنف غزل کو طرز ادا سے ایسا چمکایا کہ شمالی ہندوالوں کے لئے بھی باعث کشش ثابت ہوئی اس طرح ریختہ جنوب سے شمال پہنچا جہاں اس کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔ آخر میں ولی کے اجتہاد، اصلاح زبان اور جدت بیان کی چند مثالیں [illegible]

مشغلہ بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی و کیا مجازی کا

ہر زباں پر ہے مثل شانہ مدام — ذکر اس زلف کی درازی کا
ہوش کے ہاتھ میں عناں نہ رہی — جب سوں دیکھا سوار تازی کا
تیں دکھا کر اپیں کے مکھ کی کتاب — علم کھویا ہے دل سوں تاجی کا
آج تیری نگہ نے مسجد میں — ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
گر نہیں راز فقر سوں آگاہ — فخر بے جا ہے فخر رازی کا
اے ولی سرو قد کوں دیکھوں گا — وقت آیا ہے سرفرازی کا

(ص ۶)

دل کو گر مرتبہ ہے درپن کا — مفت ہے دیکھنا سری جن کا
جامہ زیبوں کوں کیوں تجوں کہ مجھے — گھیر رکھتا ہے دور دامن کا
اے زباں کر مدد کہ آج صنم — منتظر ہے بیان روشن کا
حکمت عشق بو علی سوں نہ پوچھ — نہیں قانون اس شناس فن کا
آئینہ تجھ سے ہو کے ہم زانو — حیرت افزا ہوا ہے گلشن کا
امن میں تجھ نگہ سوں ہیں بے ڈر — خوف نہیں مفلساں کو رہزن کا
دل صد پارہ تجھ پلک سوں ہے بند — خرقہ دوزی ہے کام سوزن کا
تجھ نگہ سوں بہ شکل شان مُغسل — دل ہوا گھر ہزار روزن کا
ہے مرے شعر میں توفیق اسے — جو کرے ورد اسے اپس من کا

ٹک ولی کی طرف نگاہ کرو
صبح سوں منتظر ہے درشن کا

(ص ۱۷)

جب صنم کو خیالِ باغ ہوا　　طالبِ نشۂ فراغ ہوا
فوجِ عشاق دیکھ ہر جانب　　نازنیں صاحبِ دماغ ہوا
رشک سوں تجھ لباں کی سرخی کے　　جگرِ لالہ داغ داغ ہوا
دلِ عشاق کیوں نہ ہوں روشن　　جب خیالِ صنم چراغ ہوا
اے ولی گلبدن کوں باغ میں دیکھ
دلِ صد برگ باغ باغ ہوا

(۱۲۲)

فدائے دلبرِ رنگیں ادا ہوں　　شہیدِ شاہِ گلگوں قبا ہوں
ہر اک مہ رو کے ملنے کا نہیں شوق　　سخن کے آشنا کا آشنا ہوں
کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا　　طلب گارِ نگاہِ باحیا ہوں
نہ کر شمشاد کی تعریف مجھ پاس　　کہ میں اس سرو قد کا مبتلا ہوں
کیا میں عرض اس خورشید رو کوں　　تو شاہِ حسن میں تیرا گدا ہوں
سدا رکھتا ہوں شوق اس کے سخن کا　　ہمیشہ تشنۂ آبِ بقا ہوں
قدم اس کے پہ رکھتا ہوں سدا سر
ولی ہم مشربِ رنگِ حنا ہوں

(۱۲۳)

خوب رو خوب کام کرتے ہیں　　یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
دیکھ خوباں کوں وقت ملنے کے　　کس ادا سوں سلام کرتے ہیں
کیا وفا دار ہیں کہ ملنے میں　　دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے — کام اپنا تمام کرتے ہیں
کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کوں — صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں
صاحب لفظ اس کوں کہہ سکیے — جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں
دل لے جاتے ہیں اے ولی میرا
سرو قد جب خرام کرتے ہیں

(ص ۱۹۲)

آج سرسبز کوہ و صحرا ہے — ہر طرف سیر ہے تماشا ہے
چہرۂ یار و قامت زیبا — گل رنگیں و سرو رعنا ہے
معنی ناز و معنی خوبی — صورت یار سوں ہویدا ہے
دم جاں بخشِ نو خطاں مجھ کوں — چشمۂ خضر ہے مسیحا ہے
کمر نازک و دہان صنم — فکر باریک ہے معمّا ہے
مو بہ مو اس کوں ہے پریشانی — زلف مشکیں کا جس کوں سودا ہے
کیا حقیقت ہے تجھ تواضع کی — یو تلطف ہے یا مدارا ہے
سبب دل ربائی عاشق — ہر بے لطف ہے دلاسا ہے
رات دن جوں ولی ہے محو خیال — جس کوں تجھ وصل کی تمنا ہے

(ص ۲۰۱)

---

(۳۹۶)

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیوں کہ حاصل ہو مجھ کوں جمعیت — زلف تیری قرار کھوتی ہے

ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب مجھ انکھاں کا خمار کھوتی ہے
کیوں کہ ملنا صنم کا ترک کروں دلبری اختیار کھوتی ہے
اے ولی آب اس پری رو کی میرے دل کا غبار کھوتی ہے

(ص ۲۹۰)

کماں ابرو پہ جو قرباں ہوا ہے دل اس کا تیر کا پیکاں ہوا ہے
بھواں تیغ و پلک خنجر نگہ تیر یو کس کے قتل کا ساماں ہوا ہے
مرا دل مجھ سوں کر کے بے وفائی پسند خاطر خوباں ہوا ہے
پیام جام دل سوں بادۂ خوں جو بزم عشق میں مہماں ہوا ہے
عزیزاں کیا ہے پروانے کے دل میں کہ جی دینا اسے آساں ہوا ہے
طبیباں کا نہیں محتاج ہرگز جسے درد بتاں درماں ہوا ہے
برنگ گل فراقِ گل رخاں میں گریباں چاک تا داماں ہوا ہے
سوادِ خطِ خوباں دل کشی میں بہارِ گلشنِ ریحاں ہوا ہے
ولی تصویر اس کی جن نے دیکھی مثال آرسی حیراں ہوا ہے

(ص ۲۵۳)

ولی کے مرغوب فارسی شعرا

اُردو کو فارسی کا جامہ پہنانے میں شمالی ہند والوں نے بہت نمایاں حصّہ لیا لیکن اس کا آغاز گجرات و دکن سے ہو چکا تھا۔ ادبی تشکیل کے پہلے دور میں شاہ علی جیوگام دھنی (گجراتی) متوفی ۹۷۳ھ کی تصانیف میں فارسی الفاظ و محاوروں کے اُردو ترجمے نظر سے گزرتے ہیں جیسے بندے سے باندی۔ نواختن سے نوازنا۔ گوش کردن سے کان دھرنا۔ محبّت داشتن سے پیار دھرنا۔ شاہ صاحب نے فارسی اوزان کو بھی اُردو میں پہلی بار روشناس کرایا۔ گجرات کے ایک اور بزرگ خوب محمّد چشتی متوفی ۱۰۲۳ھ نے بھی اپنے طور پر بیش تر الفاظ فارسی سے لے کر اُردو میں کھپا دیے ۔ جیسے غالیچے کو زلیچہ بنا لیا۔ صحیح سے سہی اور جانور سے جناور وغیرہ ۔ خوب محمّد نے بھی فارسی بحور کو اردو میں رواج دیا۔ ان بزرگ نے بحور کے متعلق (۱) "چھند چھنداں" نامی ایک رسالہ بھی لکھا اور صنائع بدائع پر بھی اُردو میں (۲) "بھاؤ بھید" نامی ایک رسالہ لکھا اور اس طرح اُردو کو فارسی کے بیش بہا ذخیرے سے مالا مال کرنا شروع کیا۔ اسی طرح اُردو میں عربی الفاظ بھی لے لیے جیسے معرفت، عرفان، ملکوت، سفلی علوی، واحد، وحدانیت وغیرہ۔

دکن میں گول کنڈہ اور بیجاپور کے سلاطین اہلِ ذوق تھے ۔ ان کے زمانوں میں بھی ایک طرف بھاشا اور سنسکرت کا زور تھا تو دوسری طرف فارسی سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ یہ زمانہ اُردو کا ابتدائی دور تھا لہذا کوئی ایک معیار قائم نہ تھا۔ جہاں بھاشا کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں تو پورے اشعار بھاشا کے نظر آتے ہیں اور جہاں ہندی شعرا نے فارسی کی طرف توجہ کی تو اُردو کے پورے پورے شعر بالکل فارسی ہو گئے ہیں۔

سلاطینِ گجرات و دکن اور صوفیا کے بعد اورنگ زیب کے زمانہ میں وَلی کا دور آتا ہے۔ تاریخِ ادبِ اردو میں یہ ایک انقلابی دور ہے۔ اس دور تک گجرات و دکن میں اُردو دوسری مقامی زبانوں کے اثرات کے ساتھ بولی اور لکھی جاتی تھی اور ایک مستقم کا معیار ضرور مقرر تھا مگر وَلی ایک ایسا مصلح شاعر پیدا ہوا جس کی دُوربین نگاہ نے زبان و ادب کی مشکلات اور مقامی دشواریوں کو پالیا ان گتھیوں کو سلجھایا اور ایک شاہ راہ قائم کردی اور اس طرح شمال، گجرات اور دکن کے خفیف فرق کو مٹاکر تینوں جگہ ایک ہی قسم کی ادبی زبان رائج کی۔

وحدتِ لسانی کا قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا اس کام کو وَلی ایسا عالم و فاضل دُوربین اور نبض شناس ہی انجام دے سکا جس کی علمی استعداد کا اندازہ اس مضمون سے بہ خوبی ہو جائے گا۔ وَلی کی علمی استعداد پر تفصیل سے بحث کریں اس سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرسری طور پر ہندوستان میں فارسی کا جائزہ لے لیں۔

ہندوستان میں محمود غزنوی کی فتوحات نے فارسی شعر و ادب کی ترقی کے لیے سازگار فضا پیدا کردی۔ سلطان کی شاہانہ سرپرستیوں کی بہ دولت شہر غزنی شعرا و علما کا مرجع بن گیا تھا محمود کے دربار کے مشہور شاعر فرخی سلطان کی اکثر مہموں میں اس کے ساتھ رہا۔ جب محمود سومناتھ کی فتح کے بعد واپس غزنی کی راہ لیتا ہے تو اسے بعض سخت دشوار گزار راستوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس واپسی سفر کی منزلیں متعین کرنا مورخوں کے لیے بہت مشکل کام تھا خوش قسمتی سے فرخی کے دیوان میں فتح سومناتھ اور سلطان کی واپسی کے متعلق ایک قصیدہ ملتا ہے جس میں فرخی نے نہایت تفصیل سے ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد ناظم پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی قابلِ قدر کتاب "سلطان محمود آف غزنہ" میں اس قصیدے سے فائدہ اٹھاکر تاریخ کے طالب علموں کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ تاریخی اہمیت سے قطع نظر فرخی کے

دیوان میں بعض ہندی الفاظ بھی ملتے ہیں۔ مثلاً کت یعنی کھاٹ یہ لفظ اسی صورت میں بیرونی نے بھی اپنی "کتاب الہند" میں استعمال کیا ہے۔ اگرچہ ہندستان پر محمود غزنوی کے سترہ حملے بہت مشہور ہیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان میں سے بعض حملوں کی حقیقت ایک آندھی سے زیادہ نہ تھی۔ یہ صرف پنجاب کا علاقہ تھا جہاں محمود اور اس کے جانشینوں نے ایک مدت تک حکومت کی اور یہ اُن علم پرست سلطانوں کا فیض تھا کہ لاہور علم و فن کا مرکز بن گیا۔ اس شہر کی مرکزی حیثیت کا اندازہ بعض ان نادرۂ روزگار ہستیوں سے لگایا جا سکتا ہے جن کی ولادت گاہ ہونے کا شرف لاہور کو حاصل ہے یا جنھوں نے اسے اپنی بود و باش کے لئے پسند کیا۔ ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے ہندستان زاد ہونے کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں نے تشکک و تذبذب کا اظہار کیا ہے لیکن اہل علم کی اکثریت کو انھیں ہندستانی تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ رونی ایک بلند پایہ قصیدہ نگار ہے اور انوری اور عرفی جیسے شاعر اس کی تقلید میں قصیدے لکھتے ہیں۔ سنائی جن کو مولانا رومیؒ "حکیم غزنوی" اور "فخر العارفین" کے نام سے یاد کرتے ہیں مسعود سعد سلمان کے مداح اور قدردان ہیں۔ غزنویوں کی بساطِ حکومت اُلٹنے کے بعد محمدؔ غوری اور اس کے غلام قطب الدین ایبک نے ہندستان میں اسلامی حکومت کی حدود کو وسیع کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا اور ان ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ دہلی میں مسلمانوں کی مرکزی حکومت قائم ہو گئی۔ قطب الدین کے غلام شمس الدین التمش اور سلطانِ قباچہ شعر و ادب کے سرپرست اور مربی تھے اور ان کے دربار میں بڑے بڑے علما اور شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ امیر خسرو سے پہلے جن ہندستانی شاعروں نے فارسی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ان کے حالات ڈاکٹر اقبال حسین پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی مفید کتاب "ہندستان کے قدیم فارسی شعرا" میں بیان کیے ہیں لیکن جس نکتہ سنج اور سخن طراز کو "طوطیٔ ہند" کہلانے کا حق حاصل ہے وہ امیر خسرو کی ذات ہے۔

انھیں خود بھی اس برتری کا پورا احساس تھا چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

چو من طوطیِ ہندم ار راست پرسی ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

خسرو قصائد میں اکثر خاقانی کا تتبع کرتے ہیں لیکن ان کی شاعرانہ عظمت کا دارومدار زیادہ تر ان مثنویوں پر ہے جو انھوں نے یا تو خدائے سخن نظامی کے جواب میں لکھیں یا جن میں اپنے زمانے کے بعض واقعات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی مثلاً دول رانی، خضر خاں اور قران السعدین۔ غزل میں ان کے پانچ دیوان ہیں۔ جب ان کے ابھی تین دیوان ہی مرتب ہو چکے تھے تو انھوں نے غرۃ الکمال کے خاتمے میں نہایت فخریہ لہجے میں اس کا دعویٰ کیا تھا کہ وہ پہلے فارسی شاعر ہیں جسے تین دیوانوں کے مالک ہونے کا فخر حاصل ہے۔ غزل گوئی میں خسرو کے علاوہ ان کے دوست اور پیر بھائی حسن سجزی بھی بلند مرتبے کے مستحق ہیں۔ ان کی بعض غزلیں سہلِ ممتنع کا درجہ رکھتی ہیں اور اسی لیے وہ "سعدیٔ ہندستان" کے لقب سے ممتاز ہیں۔ بدر چاچ اس زمانے کا مشہور قصیدہ گو شاعر ہے۔ محمد تغلق کے عہد کا ایک شاعر عصامی ہندستان کی اسلامی حکومت کی تاریخ نظم میں قلم بند کرتا ہے اس کا یہ شاہ نامہ "فتوح السلاطین" کے نام سے موسوم ہے۔ لودھیوں کے دورِ حکومت کا سب سے بڑا شاعر جمالی ہے جس کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا ہے ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات تو عینِ ذات می نگری در تبسمی

بابر کی آمد سے ہندستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ علم و فن میں تیموری شہزادوں کا ذوقِ سلیم کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ "واقعاتِ بابری" کے صفحات اس عالی حوصلہ کشور کشا کی خوش مذاقی کے آئینہ دار ہیں۔ ہمایوں کو نقلی اور عقلی علوم میں پوری دست رس تھی۔ اس کے علمی شوق کا اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ فوجی مہموں کے دوران میں بھی کتابوں کے مطالعے میں مستغرق رہتا تھا جیسا کہ "مرآتِ سکندری" کا مصنف اپنے

باپ محمدؐ منجھو سے روایت کرتا ہے جو ہمایوں کے قیام گجرات کے زمانے میں کتاب داری کے فرائض بجالاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اکبر کو اپنے باپ کی طرح علمی تحصیل کا موقع نہ ملا تاہم اس نے اپنی خداداد قابلیت سے ایک ایسے عادلانہ نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی جس سے ہندستانی تعلیم، معاشرت اور تمدن میں غیر معمولی تغیرات ظہور پذیر ہوئے۔ سولھویں صدی عیسوی میں اس نے جس وسیع المشربی کا ثبوت دیا وہ دورِ حاضر کی حکمران قوموں کے لیے بھی باعثِ رشک ہے۔ اس کا عہدِ حکومت ہندستان میں فارسی ادب اور فنون کا زریں عہد ہے۔ سب علوم و فنون کے نمایندے اس کے دربار کی زینت کا موجب تھے۔ نقاشی، خوش نویسی اور موسیقی کے بڑے بڑے ماہر اپنے اپنے کارناموں سے علم و فن کو مالامال کر رہے تھے۔ ہندستان میں عقلی علوم کا صحیح فروغ بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔ ایران میں صفوی بادشاہوں نے تہذیب و تمدن کی ترقی میں بڑی فیاضی اور کشادہ دلی سے کام لیا لیکن چوں کہ مذہبی تعصب کی وجہ سے ان کی زیادہ تر توجہ دینی علوم کی اشاعت پر تھی اس لئے شعر و ادب کے پجاریوں کو اپنے حوصلے کے مطابق ایران میں وسیع میدان میسر نہ آسکا اور مجبوراً انھیں ہندستان کا رخ کرنا پڑا۔ یہاں اکبر کی شاہانہ فیاضیوں نے اُن کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور ان کے لئے ایسے مواقع بہم پہنچائے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کی نشو و نما کامل طور پر کر سکے ان میں سے اکثر کو ہندستان کی مٹی اس طرح دامن گیر ہوئی کہ وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ بعض ایسے احسان ناشناس بھی تھے کہ ہندستان کی مہمان نوازی کا لطف اٹھانے کے باوجود بھی اس ملک کو گالیاں دیتے رہے۔ اکبر کی شعر و سخن کی سرپرستی کا ایک واضح اور روشن ثبوت اس کا غزالی مشہدی کو ملک الشعرا کے عہدے پر مقرر کرنا ہے۔ غزالی احمد آباد کے مشہور مقام سرکھیج میں مدفون ہے۔ غزالی کی وفات کے بعد فیضی اس منصب پر فائز ہوا۔ اکبر کے علاوہ جن امرا نے شعرا اور علما کی سرپرستی کی ان میں سب سے زیادہ ممتاز حکیم ابوالفتح گیلانی اور عبدالرحیم خان خاناں ہیں۔ "مآثرِ رحیمی" کے

مصنف کا بیان ہے کہ فیضی اور عرفی کی تازہ گوئی حکیم ابوالفتح کی تعلیم و تربیت کا فیض ہے۔ خان خاناں کی فیاضیوں کی بدولت شعرا اور علما کی ایک بڑی جماعت اس کے گرد جمع ہو گئی تھی۔ مآثر رحیمی کے صفحات اس کی فیاضی کے واقعات سے پُر ہیں۔ اسی طرح صائب کی شاعرانہ ترقی میں ظفر خاں احسن والی کشمیر کی اصلاح و تربیت کار فرما تھی۔ جہانگیر اور شاہجہان کے زمانہ میں طالب آملی اور کلیم ملک الشعرائی کے امتیاز کے مالک رہے لیکن اورنگ زیب کا دینی تقشف اس قسم کی چیزوں کو جاری رکھنے کی اجازت نہ دے سکا۔ اور اس نے یک قلم ملک الشعرا کے عہدے کو ختم کر دیا۔ اس [illegible] شہنشاہ کے زہدِ خشک کے باوجود شعر و سخن کا ہنگامہ گرم رہا۔ گیارھویں صدی ہجری میں بیسیوں شعرا نے ہندستان میں فارسی زبان میں دادِ سخن دی ان میں سے مشہور اور ممتاز شعرا فیضی، نظیری، ملک قمی، ظہوری، نزالی، طالب، کلیم، صائب، شیدا، قدسی، شوکت، [illegible]، غنی، [illegible] سرہندی اور بیدل ہیں۔

اُردو کا سب سے پہلا بڑا شاعر ولی گیارھویں صدی کے نصف دوم میں پیدا ہوا۔ [illegible] اس کی ولادت کی صحیح تاریخ متعین نہیں کی جا سکتی لیکن اس کی تاریخ وفات [illegible] سکا شبہ نہیں رہا۔

ولی ۱۱۱۹ھ یا زیادہ صحیح ۱۱۳۸ھ میں راہی ملک عدم ہوا [illegible] ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم ولی کے مرغوب فارسی شاعروں کا ذکر کریں اور [illegible] شاعری کے اثر کا اندازہ لگائیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان [illegible] کر دیا جائے جو گیارھویں اور بارھویں صدی کے شعرا کے کلام میں [illegible] مولانا شبلی نے شعر العجم کی تیسری جلد کے شروع میں تفصیل [illegible] یہاں انھی کے خلاصے پہ اکتفا کرتے ہیں۔

اگرچہ دوسرے اصنافِ سخن میں بھی شاعروں نے طبع آزمائی کی لیکن درحقیقت یہ عہد غزل کی ترقی کا عہد ہے۔ فلسفہ، مثالیہ، تغزل اور مضمون آفرینی کی طرف زیادہ تر توجہ رہی، عرفی نے فلسفے کی آمیزش کی، میرزا صائب مثالیہ شاعری کے دلدادہ تھے، تغزل جسے غزل کی جان کہیں تو بجا ہے نظیری کے یہاں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے مضمون آفرینی کا وصف تمام متاخرین میں کم و بیش موجود ہے۔ اس طرز کو نمایاں کرنے والا جلال اسیر ہے۔ شوکت بخاری، قاسم دیوانہ وغیرہ نے اس کو ترقی دی اور بیدل اور ناصر علی کی شاعرانہ بزرگی کا دارومدار بھی اس خصوصیت پر ہے۔ قصیدے میں عرفی نے ایک خاص طرز قائم کیا۔ ظہوری اور طالب آملی نے بھی قصیدے کو ترقی دی۔ مثنوی متاخرین کی رنگینی کی وجہ سے مثنوی نہ رہی بلکہ غزل بن گئی۔ اس عہد کا بہترین مثنوی گو شاعر فیضی ہے۔ اس زمانے میں رباعی نے فلسفے کے تمام مسائل ادا کر دیے سحابی جو اکبر کا ہم عصر تھا اس نے تقریباً سترہ ہزار رباعیاں لکھیں۔

مضمون آفرین متاخرین عام طور پر جو بات کہتے ہیں وہ صاف طریق پر نہیں بلکہ پیچیدہ انداز میں کہتے ہیں۔ یہ پیچیدگی مبالغے اور دور از کار استعارات کے لیے ذمے دار ہے۔ صنعتِ ایہام کی وبا عالم گیر ہے اور متاخرین کی شاعری کا بڑا حصہ اسی کی نذر ہو گیا ہے۔ اس دور کی ایک بڑی خصوصیت استعارات کی نزاکت اور تشبیہات کی جدت ہے۔ اس زمانے میں الفاظ کی نئی تراشیں اور نئی نئی ترکیبیں کثرت سے پیدا ہوئیں۔ عرفی ان نئی ترکیبوں کا بادشاہ ہے۔

ولی کے لیے یہ عام طور پر مشہور ہے کہ اس کے استاد شاہ گلشن (متوفی ۱۱۴۰ھ) نے اسے مشورہ دیا کہ وہ تمام خیال جو فارسی میں بے کار پڑے ہیں کام میں لائے۔ اس مشورے کی تاریخی اصلیت کچھ ہی ہو لیکن یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ ولی کے یہاں وہ

تمام مضمون، تشبیہیں، ترکیبیں اور استعارے موجود ہیں جو فارسی شعرا کا طغرائے امتیاز ہیں۔
"نور المعرفت" کے علاوہ جو ولی کی فارسی انشا پردازی کا قابلِ تعریف نمونہ ہے اور جس میں فارسی
اشعار بھی ولی کے اپنے قلم کا نتیجہ ہیں اس کا کلیات ہمارے لیے اس معاملے میں بہترین رہنما ہے مولوی
احسن مارہروی نے جہاں ولی کی شاعرانہ خصوصیات سے بحث کی ہے انھوں نے فارسی ترکیبوں،
تشبیہوں اور استعارات کا بھی ذکر کیا ہے جو ولی کے کلام میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں لیکن تعجب ہے
کہ انھوں نے اس بات کا پتہ چلانے کی کوشش نہ کی کہ ولی نے فارسی شعرا کے کلام کا گہرا مطالعہ
کیا ہے اور بعض شاعروں سے وہ خاص طور پر متاثر ہے۔ صاحب "شعرالہند" نے پہلی جلد
میں بیان کیا ہے کہ ولی نے امیر خسرو اور نظیری کی پیروی کی بلکہ نظیری کا یہ مضمون ؎

نہ چناں گرفتہ ای جا بہ میانِ جانِ شیریں کہ تواں ترا و جاں را ز ہم امتیاز کردن

بہ عینہٖ اڑا لیا ہے ؎

ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں مشکل ہے جیو سوں تجھ کو اب امتیاز کرناں

یوں تو ولی کی ایک پوری غزل فارسی شاعروں کے ناموں سے مملو ہے لیکن زیادہ تر
وہ ان شاعروں کا ذکر کرتا ہے جو قصیدے اور غزل کے میدان کے شہسوار ہیں۔ انوری اور
خاقانی کی طرف اس نے بعض بڑے لطیف اشارے کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ معشوق سر سے قدم
تک اپنی جھلک میں گویا انوری کا روشن قصیدہ ہے[۵۱] میری طرف سے یہ بات انوری کو کہہ دو کہ ولی
سا صاحب سخن جہاں میں پیدا ہوا ہے[۵۲] ولی کا یہ ریختہ اسے جا کر سناؤ جو انوری کے مانند فکرِ روشن
رکھتا ہے[۵۳] خاقانی کی یاد دل سے بھلا دو، ولی کا ارشاد دیکھو کہ وہ اب اشکِ انوری ہے[۵۴]۔ انوری
ہی پہ کیا موقوف ہے خاقانی اور عرفی بھی میرے سخن کے قائل ہیں[۵۵]۔ جب ولی
معشوق کی تعریف میں ریختہ پڑھے تو کوئی تعجب نہیں کہ حسانِ عجم (خاقانی) قبر سے اٹھ کر اسے

---

۵۱ کلیات ولی طبع اول ص ۷۲ ۵۲ ص ۱۷۹ ۵۳ ص ۸۹ ۵۴ ص ۲۸۸ ۔ ۵۵ ص ۱۵۴

سنئے[۵۱]۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انوری و خاقانی میرا یہ رنگین قصیدہ مُن پائیں تو ان پر وجد کی کیفیت
طاری ہوجائے[۵۲] یہ اشارے صاف صاف اس بات کا پتا دیتے ہیں کہ ولی انوری و خاقانی
کے قصائد کو بہ نظرِ استحسان دیکھتا ہے۔ ان سے بھی بڑھ کر وہ قصیدے کی صنف میں عرفی کا قائل
معلوم ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ عرفی کا ذکر کرتا ہے بلکہ اس کی تقلید میں قصیدے لکھتا ہے
اپنے ایک قصیدے کے آخر میں جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہوا ہے خلق اُپر پھر کے فضلِ سبحانی　　کیا ہے ابر نے رحمت سوں گوہر افشانی

وہ عرفی کے اس مصرع کو لوحِ دِل پر لکھتا ہے ؎

کہ ایں قصیدہ بیاضی بود نہ دیوانی

ایک اور قصیدے میں جو اس نے حضرت علیؓ کی منقبت میں لکھا ہے اور جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہر ایک رنگ میں جو دیکھا ہوں چرخ کے نی رنگ　　ہوا ہوں غنچہ صفت جگ کے باغ میں دِل تنگ

عرفی کے اس قصیدے کی پیروی کی گئی ہے ؎

تبارک اللہ ازآں آسماں شتاب کرنگ　　کہ نعل آئینہ رنگش نہ دید رنگ درنگ

جیسا کہ مولانا شبلی نے کہا ہے کہ "عرفی قصیدے میں ایک خاص طرز کا مالک ہے اور اپنی گوناگوں
خوبیوں کی وجہ سے اس کے قصیدے ہندوستان میں بہت مقبول رہے ہیں"۔ غالباً یہ اسی مقبولیت
کا نتیجہ ہے کہ ولی عرفی کی پیروی کرتا ہے۔

جہاں تک غزل میں امیر خسرو اور نظیری کے تتبع کا تعلق ہے ہم مولوی عبدالسلام ندوی
کی رائے نقل کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ولی نے امیر خسرو کی اس مشہور غزل کی زمین میں ؎

جاں زتن بُردی و درجانی ہنوز　　دردہا دادی و درمانی ہنوز

۵۱۔ صفحہ ۹۵ ۵۲۔ صفحہ ۲۷

اپنی یہ غزل لکھی ہے ؎

تو ہے رشکِ ماہِ کنعانی ہنوز	تجھ کوں ہے خوباں میں سلطانی ہنوز

امیر خسرو کا یہ شعر زباں زدِ عام ہے ؎

از سرِ بالینِ من برخیز ای ناداں طبیب	دردمندِ عشق را دارو بہ جُز دیدار نیست

ولی نے یہی مضمون اس طرح باندھا ہے ؎

مجھ درد پر دوا نہ کرو تم حکیم کا	بن وصل نیں علاج برہ کے سقیم کا

بالکل اسی طرح اس نے خواجہ حافظ کے اس مصرع کو ؎

بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبا را

اُردو کا جامہ پہنایا ہے ؎

لباس خوب کی حاجت نہیں حق کے سنوارے کو

امیر خسرو کی 'مطلع الانوار' بھی اس کے زیرِ مطالعہ رہی ہے چناں چہ ایک جگہ کہتا ہے کہ ہر جگہ معشوق کے رخسار کو دیکھنا گویا 'مطلع الانوار' کا مطالعہ کرنا ہے[۵۱]۔ نظیری نے چوں کہ احمد آباد ہی میں بود و باش اختیار کر لی تھی اس لیے قدرتی طور پر ولی نظیری کے کلام سے متاثر ہوا ہوگا۔ ایک جگہ اقلیمِ سخن میں اپنی تاج داری کا ڈنکا بجاتے ہوئے اتنا بھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کے سامنے نظیری کا نام لیا جائے[۵۲]۔ نظیری کی ایک غزل کا یہ مشہور شعر ؎

تحقیق حالِ ما ز نگہ می تواں نمود	حرفے ز حالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

ولی اسی قافیے اور ردیف کی پابندی کرتے ہوئے غزل لکھتا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہم نے قدم رنجہ کیا میری طرف آج	یہ نقشِ قدم صفحۂ سیما پہ لکھا ہوں

---

۵۱ ص ۸ ۔ ۵۲ ص ۱۴۳

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا غزل نظیری کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔

محبوب کے ابرو کی بیت ولی کو ہلالی کا شعر نظر آتا ہے[۵۱]۔ ہلالی مشہور غزل گو ہے اور ایک مثنوی "شاہ و درویش" کا مصنف جس کے پلاٹ پر بابر نے اپنی "توزک" میں کڑی نکتہ چینی کی ہے اس مثنوی میں بادشاہ معشوق ہے اور درویش عاشق اس سے پہلے جتنی مثنویاں فارسی میں لکھی گئیں ان میں معشوق ہمیشہ عورت ہوتی ہے۔ ہلالی نے اس جادۂ اعتدال سے ہٹ کر ایک بادشاہ کو معشوق بنا دیا ہے۔ جس طرح محبوب کی ابرو ہمارے شاعر کے دل میں ہلالی کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح اس کے لبِ حیات بخش زلالی کو ولی کے سامنے لا کے کھڑا کر دیتے ہیں۔ زلالی تازگی و جدّتِ خیال کے لئے ممتاز ہے۔ اس نے اپنی مشہور مثنوی "محمود و ایاز" ۱۰۲۱ھ میں مکمل کی۔ اس کی تاریخِ اختتام "الٰہی عاقبت محمود باشد" ہے۔ زلالی ۱۰۳۱ھ میں وفات پاتا ہے۔ ولی زلالی کی مثنوی گوئی کو محبوب کے ہونٹوں کا فیض سمجھتا ہے ؎

ابیات صاف و رنگیں رکھتا ہے مثنوی ہیں   تیرے بیاں کا گویا شاگرد ہے زلالی

عاشق کی مدّ نگاہ ولی کے نزدیک خیالی کے مصرع کی طرح نا محدود ہے اس لیے اس کے معنی کا احاطہ صرف ایک رمزداں ہی کر سکتا ہے[۵۲]۔ یہ مولانا خیالی خواجہ عصمت اللہ بخاری کے شاگرد ہیں۔ اور دولت شاہ اپنے تذکرے میں ان کے پاکیزہ، رواں اور درد مندانہ کلام کی تعریف کرتا ہے۔

مولانا جامی نے "بہارستان" میں خیالی کے مندرجہ ذیل شعر نقل کیے ہیں ؎

---

۵۱ صنـ ۲۰ ـ ۵۲ صـ ۲۲۹

اے تیرِ غمت را دلِ عشّاق نشانہ   خلقی بہ تو مشغول و تو غائب زمیانہ
گہ معتکفِ دیرم و گہ ساکنِ مسجد   یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بہ خانہ

ابوالفضل نے جب کشمیر میں عام عبادت خانہ بنوایا تو اس پر خیالی کے یہ شعر کندہ کرائے۔

ہم پہلے مشہور رباعی گو شاعر سحابی کا ذکر کر آئے ہیں۔ ولی محبوب کی چار ابرو کو رباعی سے تشبیہ دیتے ہوئے عاشق کی چشمِ گریاں کے لیے سحابی کا تخلص تجویز کرتا ہے[51]۔ اس قسم کی رعایتِ لفظی کی مثال ایک اور جگہ بھی پائی جاتی ہے جہاں ولی کا رنگین نغمہ سن کر عراقی عراق میں عرقِ خجالت میں ڈوب گیا ہے[52]۔

عراقی شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید ہیں اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں شیخ بہاء الدین زکریا کی خدمت میں ملتان پہنچے۔

مولانا جامی کا ذکر 'کلیات' میں کئی بار آیا ہے اور ایک جگہ تو ولی ساقی کی چشمِ مست دیکھ کر گردنِ مینا کی بیاض پر جامی کا دیوان لکھتا ہے[53]۔

اور دوسری جگہ محبوب کی آنکھوں کی بہارِ نیم خوابی کو دیوانِ جامی سے انتخاب کیا ہوا رنگین مضمون تصوّر کرتا ہے[54]۔

اپنے کلام کی شہرت کا بلبلِ تبریز (یعنی صائب) کی شہرت سے مقابلہ کرتا ہے[55]۔

ناصر علی سرہندی ولی کے ممتاز معاصرین میں سے ہیں اور سنہ ۱۱۰۸ھ میں دہلی میں داعیِ اجل کو لبیک کہتا ہے۔ ولی کو اپنی شاعرانہ برتری کا اس درجہ احساس ہے کہ ایک جگہ وہ ناصر علی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ناصر علی کو مصرع لکھ بھیجوں تو وہ اسے سن کر بیرق کے تند صرصر کی طرح اچھل پڑے[56]۔

---

[51] ص ۲۸۹ ۔ [52] ص ۱۸۳ ۔ [53] ص ۱۷ ۔ [54] ضمیمہ ص ۳۵ ۔ [55] ص ۱۱

پڑے سن کر اُچھل جیوں مصرع برق   اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

فارسی شعر و سخن سے ولی کی دلبستگی ظاہر ہے چناں چہ ایک پوری غزل اس نے فارسی زبان کے شعرا کے لیے وقف کردی ہے اور انھی کے ناموں کی مناسبت سے اپنے محبوب کے اوصاف بیان کیے ہیں۔

محبوب کا چہرہ مشرقی کے کلام کی طرح تاباں۔ اس کا حسن انوری کے قصیدے کی طرح بُراق جلوہ جمالی کے اشعار کی طرح دل فروز آنکھ جامی کی طرح سرخوش پیشانی فردوسی کی طرح کشادہ اور ابرو ہلالی کے مانند خمیدہ ہے۔ اس کا فہم ریاضی کے مانند تیز ہے۔ شگفتگیٔ طبع کے اعتبار سے وہ گلشن ہے۔ اس کا دل دانا اور فطرت علی (ناصر علی) کی بلند فطرت کے مشابہ ہے، اس کی زبان فصاحت میں فصیحی کی ہم پلہ اور باتیں زلالی کے اشعار کی طرح میٹھی ہیں اس کی نگاہ فیضی و قدسی کے تخیل کے مانند بلند پرواز ہے، طالب آملی اور شیدا کی طرح اس کی سرشت پاکیزہ ہے اس میں بدر چاچ کا سا کمال اہلی کا سا دل اور غزالی مشہدی کی سی مست آنکھیں ہیں روشن ضمیری میں محبوب امیر خسرو، صائب تبریزی اور شوکت بخاری سے ہم دوش ہے اور اس کی ابرو شاعر کے میلے وصالی کے طغرا کی طرح خوب صورت ہے، چوں کہ دل محبوب کے قد و ابرو کا شوقی اور مائل ہے اس لیے اس کا ہر ایک شعر نعمت خانِ عالی کی طرح بلند اور اس کا ہر ایک مصرع خیالی کے مضمون کی طرح ایک خاص کیفیت کا حامل ہے۔

ولی کی یہ غزل اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ولی فارسی شعرا کے کلام سے بہت متاثر ہے اور وہ اکثر انھی کی بولی بولتا دکھائی دیتا ہے اگر ان فارسی تشبیہات و استعارات سے قطع نظر بھی کریں جو فارسی زبان کا سرمایہ ہیں تو بھی ہمیں بعض جگہ ولی کی طبیعت کا رجحان

فارسی میں شعر کہنے کی طرف نظر آتا ہے۔ بعض اوقات بے اختیار فارسی مصرعے اس کی زبانِ قلم پر آجاتے ہیں مثلاً ؎

بس کہ کثرت شد بہ کوے آں صنم　　عاشقِ مسکیں کو جا نہیں الغیاث

بو الہوس تقلیدِ عاشق می کنند　　یہ پہنچتی اس کوں سزا نہیں الغیاث

دین و ایمانم ربودند گُل رخاں؛ (ربودی گل رخاں)　　دِل کے تئیں رہنے کو جا نہیں الغیاث

ولی کے بعض اشعار ایک آدھ لفظ کی تبدیلی سے فارسی شعر بن جاتے ہیں مثال کے طور پر یہ شعر لیجئے ؎

خوبیٔ اعجازِ حسنِ یار اگر انشا کروں　　بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

گر کروں کی جگہ کنم رکھ دیا جائے تو شعر فارسی زبان کی ملک ہو جائے گا۔

ولی کی فارسی دانی کا ایک بیّن ثبوت وہ فارسی محاورے ہیں جن کا ترجمہ وہ جابجا اپنے اشعار میں کرتا ہے اس قسم کے محاوروں کی ایک مختصر فہرست نذرِ قارئین کی جاتی ہے۔

دل بستن بہ چیزے ۔ کسی چیز سے دل باندھنا ؎

ولی جن نے نہ باندھیا دِل کوں اپنے نونہالاں سے　　نہ پایا ان نے پھل ہرگز جہاں میں زندگانی کا

خوش آمدن چیزے ۔ کسی چیز کا پسند آنا ؎

نہ جاؤں صحنِ گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجھ کوں　　بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہ تابی کا

دم زدن از چیزے ۔ کسی چیز کا دعوا کرنا ؎

ہوئی ہے آرسی جوگن ترے مکھ کے تصوّر میں　　بھبھوتی مکھ پہ لیا دم مارتی ہے خاک ساری کا

دامن کسے گرفتن ـــ کسی کے ساتھ چمٹ جانا ؎

مجھے بولیا کہ تو واقف نہیں عشقِ حقیقی سوں   تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشقِ مجازی کا

شیوہ گرفتن ـــ طریقہ اختیار کرنا ؎

کرے تا مجھ پری رو سے طلب یک بوسۂ شیریں   لیا ہے اس سبب دل نے مرے شیوہ گدائی کا

دنبال چیزے گرفتن ـــ کسی چیز کا پیچھا کرنا (لینا) ؎

جہاں جاتا ہوں وہاں آتا ہے سایے کے نمن پیچھے   ترے بہانے اے ظالم لیا دنبال عاشق کا

روا داشتن چیزے ـــ کسی چیز کو روا سمجھنا ؎

رکھتا ہے کیوں جفا کو مجھ پر روا اے ظالم   محشر میں تجھ سوں میرا آخر حساب ہوگا

آب کردن ـــ پگھلانا، منفعل کرنا ؎

اے ولی دل کوں آب کرتی ہے   نگہ چشم شرمگیں کی ادا

نماز کردن ـــ نماز ادا کرنا، تسلیمات بجالانا ؎

اے قبلہ رو ہمیشہ محراب میں بھواں کی   کرتی ہیں تیری پلکاں مل کر نماز گویا

گرم شدن بازار ـــ بازار کا تیز ہونا ؎

ہوا تجھ غم سے جاری شوق کا طومار ہر جانب   ہوا ہے گرم تیرے عشق کا بازار ہر جانب

عبارت بودن از چیزی ـــ کسی چیز سے مراد لینا ؎

دیکھے سوں مجکوں آج شب و روز ایک ہے   وہ زلف و رخ کہ جن سے عبارت ہے دن و رات

رخت بستن ـــ بوریا بستر باندھنا، چل دینا ؎

مکھ اپر تیرے ہے ایسی جھلجھلاٹ   جس کے دیکھے ہوش نے باندھیا ہی رخت

حساب چیزے گرفتن ـــ کسی چیز کی پروا کرنا، کسی چیز سے ڈرنا ؎

ہے جلوہ گر صنم میں بہارِ عتاب آج	لیتا ہے اس کے ناز و ادا کا حساب آج

تماشا کردن ـــ دیکھنا ہ

تجھ مکھ کا نور جب سوں تماشا کیا ولی	گڑوا لگا ہے جب سے جگت میں مرورِ صبح

کمر بستن بر چیزی ـــ کسی چیز کے لئے مستعد ہونا ہ

آیا جو کمر باندھ کے تو جور و جفا پر	میں جی کوں تصدق کیا تجھ بانکی ادا پر

رام شدن ـــ تابع ہونا ـــ رم کردن گھبرا کر بھاگنا ہ

رام تجھ امر کا ہوا ہے ولی	گر ہے انصاف اس سے رم مت کر

مہمیز کردن ـــ گھوڑے کو ایڑ لگانا ہ

شوخ نکلا جب قدم کو تیز کر	ناز کے شبدیز کوں مہمیز کر

سبز شدن سخن ـــ بات کی رسائی ہونا، بات کا برمحل ہونا ہ

فصاحت کیا کہوں اس خوش دہن کی	کسی کا واں نہیں ہوتا سخن سبز

عجب کردن از چیزے ـــ کسی چیز پر متعجب ہونا ہ

اس چشمِ اشک بار سوں میری عجب نہ کر	سینے کا داغ تجکوں دکھایا نہیں ہنوز

لباس در بر کردن ـــ کپڑے پہننا ہ

کیا ہوں بر میں اپس کے لباسِ عریانی	ولی برہ نے دیا یو قبا سبھی تشریف

قول دادن ـــ وعدہ یا اقرار کرنا ہ

قول مجھے دے، نہ دے رسمِ وفا ہاتھ سوں	آ ولی سوں مل، نہ مل غیر سوں شیریں سخن

ساز کردن بہ کسے ـــ کسی سے نباہ کرنا، سازگار یا موافق ہونا ہ

شاید غزل ولی کی لے جا اسے سنا دے	اس واسطے بجا ہے مطرب سوں ساز کرناں

جا کردن ـــــ ٹھیرنا، مقام کرنا ؎

گوہر اس کی نظر میں جا نہ کرے   جن نے دیکھا ہے آب و تاب سخن

بجا ماندن ـــــ ہوش میں رہنا، اپنی جگہ پہ قائم رہنا ؎

سخن کوں دیکھ کے دشوار ہو بجا رہنا   نگاہ تیز نگاہاں ہے خار آتش حسن

گوش کردن ـــــ سُننا ؎

یک بار میری بات اگر گوش کرے تواں   ملنے کوں رقیباں کے فراموش کرے تواں

گو بردن از چیزے ـــــ کسی پر سبقت لے جانا ؎

ہیں مغز میں پستے کی نمط تل کے سبب یوں   گویا یہ لباں لے گئے گو تنگ شکر سوں

بر سر سخن آمدن ـــــ بات شروع کرنا ؎

آوے وہ نوبہار اگر بر سر سخن   طوطی کوں لاجواب کرے یک جواب میں

حلِ عقدہ شدن ـــــ عقدہ حل ہونا

گرہ گرفتن در دل ـــــ پیچ و تاب کھانا ؎

نہ ہووے اے ولی حل ہرگز اس کا عقدۂ مشکل   تماشے سوں کہ جن نے دل منیں اپنے گرہ پکڑی

در بر کشیدن ـــــ بغل گیر ہونا ؎

تیرے اس حسنِ عالم گیر کوں کھینچا اپس بر میں   مگر رکھتی ہے کیا یہ آرسی طالع سکندر کے

قلم شدن ـــــ کٹنا ؎

نرگس قلم ہوئی ہے سجن تجھ نین اگے   شکر ڈلی ہے آب میں تیرے بچن اگے

سر کردن چیزے ـــــ کسی چیز کو شروع کرنا ؎

جس وقت سر کروگے بیاں اس کی زلف کا   سودا زدوں پہ غم کے سیاہ رونہ لاؤگے

درجا نہ گنجیدن ــــ جامے میں نہ سمانا ہ

جیوں گل شگفتگی سوں جامے میں نہیں سماتا ‏ ‏ جب سوں سنا ولی نے رنگیں ادا کی گالی

چیں بر جبیں آوردن ــــ تیوری چڑھانا ہ

عاشق کے دیکھنے سوں لاتا ہے چیں جبیں پر ‏ ‏ ای خوش ادا ہیں خوش ہوں تیری یہ ناخوشی سے

کار فرمودن کسے را ــــ کسی سے کام لینا ہ

غیرت سوں کام فرما نامحرموں سے مت مل ‏ ‏ ہے عین مہربانی اس مہرباں کی گالی

چشم داشتن ــــ امید رکھنا ہ

چشم رکھتا ہوں اے سجن کہ پڑھوں ‏ ‏ تجھ نگہ سوں قصیدۂ جامی

بار یافتن ــــ بار پانا ہ

ادب کے اہتمام آگے نہ پاوے بار وہاں ہرگز ‏ ‏ تیرے ساے کی پابوسی کو گر رنگ ایاز آوے

رشک بردن بر کسے ــــ کسی پر رشک کرنا ہ

مجھ حال اوپر ہالۂ ماہ رشک لجاوے ‏ ‏ گر خواب میں وہ نو خط شیریں بچن آوے

بر کرسی نشاندن ــــ کسی چیز کو باموقع و با محل کرنا ہ

ولی ارباب معنی میں اسے ہے عرش کا رتبہ ‏ ‏ پری زادانِ معنی کوں جو کرسی پہ بٹھلاوے

الفت گرفتن بہ چیزی ــــ کسی چیز سے مانوس ہونا، کسی چیز سے الفت کرنا ہ

غیر سوں الفت پکڑنا ہجر میں درکار نہیں ‏ ‏ دم بہ دم آہ دل بے تاب اگر دم ساز ہے

جفا کشیدن ــــ ظلم سہنا ہ

سدا عاشقاں کھینچتے ہیں جفا ‏ ‏ جفاکار ہے گردش افلاک کی

در فرمان کسے شدن ــــ کسی کا تابع ہونا ہ

اِس ناز کے مت ہو فرمان میں قسم ہے تجھے ایزدِ پاک کی

دل سرد شدن از چیزے — کسی چیز سے اُکتا جانا ۵

وہ آبِ خضر سوں دل سرد کیوں نہ ہو دائم یہ حوضِ پاک سوں جو کئی کہ آپیا پانی

بتنگ شدن — تنگ ہونا ۵

اے دوستاں بہ تنگ ہوا ہوں میں ہوش سے چنچم کا ناؤں لے کے مجھے بے خبر کرو

بازارِ کسے سرد کردن — کسی کے بازار کی رونق کم کرنا ۵

اپنے شیریں سخن کو دے کے رواج سرد بازارِ قند کرتے ہیں

ولی کے کلام میں ہندوستانی عنصر

اس کتاب کے باب "ولی کی علمی استعداد اور ولی کے مرغوب فارسی شعراء" ولی کے عقیدت مندوں پر واضح ہو چکا ہوگا کہ ولی اپنے زمانے کے علوم میں ید طولیٰ رکھتا تھا اور اسی طرح فارسی ادب میں بھی اُسے مہارت تامہ حاصل تھی۔ جس طرح ولی کے قدردانوں نے مذکورہ بالا پہلوؤں پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالی تھی اور انھیں کبھی اس بات کا خیال نہ آیا تھا کہ ولی ایک عالم فاضل ہونے کے اعزاز کا مستحق ہے اور اس کی فارسی دانی اس کی علمی استعداد کا ایک اہم حصہ ہے۔ بعینہٖ ولی کے کلام میں جو معتدبہ ہندوستانی عنصر موجود ہے اسے بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اور اس پہلو کی طرف کوئی خاص توجہ مبذول نہیں کی گئی۔ احسن مرحوم نے کلیات ولی کے دیباچہ بزم "الموسیٰ" کے عقیدت مندوں نے "ولی نمبر" اور جامعہ عثمانیہ کی طالبات نے نذر ولی میں عقیدت کے پھول چڑھائے۔ اور ولی کے متعلق متعدد پہلوؤں پر قابل قدر مضامین لکھے لیکن ولی کے کلام میں ہندوستانی عنصر کی طرف کسی نے اپنی توجہ منعطف نہ کی۔

بعض ادبی اور علمی حلقوں میں اردو شاعری پر اس کے بدیسی ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ معترضوں کا کہنا ہے کہ اردو شاعری فارسی ادب کے گہوارے میں پلی پھولی اور اس کی اصل کائنات یہ ہے کہ وہ فارسی شاعری کی ایک کامیاب نقالی ہے۔ یہ کیا ظلم ہے کہ ایک شاعر ہندوستان میں بیٹھا شعر کہہ رہا ہے لیکن اس کے پیش نظر کوہ ہمالیہ کی سربفلک چوٹیاں نہیں ہوتیں بلکہ وہ اپنے تخیل میں البرز، دماوند، اور کوہ طور کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ہندوستان کی ندیاں، گنگا اور جمنا اس کی نظروں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ وہ ابھی تک یہی محسوس کر رہا ہے کہ وہ دجلہ و فرات یا جیحون و نیل کے کنارے بیٹھا داد عیش دے رہا ہے۔ ایران قدیم کے

بہادر رستم و بہمن کی شجاعت کی داستانیں وہ مزہ لے لے کر بیان کرتا ہے۔ لیکن کبھی بھولے سے بھی اس کی نظر بھیم اور ارجن کی طرف نہیں اٹھتی۔ اگر کبھی اردو شاعر بہار کا منظر پیش کرنا بھی چاہتا ہے تو عالم تصور میں وہ اپنے کو ایران کے حسین و دلکش مرغزاروں میں سرگرم تماشا پاتا ہے۔ غرض معترضین کی نظروں میں اردو شاعر کے یہاں غیر وطنی (بدیسی) عنصر بہت زیادہ غالب ہے۔

اگرچہ اس اعتراض کا جواب بعض حامیانِ اردو کی طرف سے بہت قابلیت کے ساتھ دیا گیا ہے تاہم اس اعتراض کی معقولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو شاعری کی ابتدائی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شروع میں ہندوستانی عنصر شریک غالب کی حیثیت رکھتا تھا اور گجرات اور دکن کے نکتہ سنجوں کی ابتدائی کوششیں اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔ البتہ شمالی ہند کی حالت قدرے مختلف تھی۔ اور وہاں فارسیت کا غلبہ نسبتاً زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں ادبی قطع و برید سے بہت زیادہ کام لیا گیا اور رفتہ رفتہ ہندی عنصر کم ہوتا گیا۔

اگر ولی کے کلام کا مطالعہ بغور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ولی اور اس کے پیش روؤں نے جہاں اردو ادب کے دسترخوان پر فارسی کی چاشنی کے ساتھ انواع و اقسام کی نعمتیں تیار کر کے رکھی ہیں وہاں انھوں نے ہند کی نمکینی سے بھی اس دسترخوان کو آراستہ کیا ہے۔ الغرض ولی تک کا سرمایۂ ادب، عرب ایرانی ادب کہلانے کے بجائے ہند ایرانی ادب کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

شاعری کے دور۔ اردو شاعری سب سے پہلے دو بڑے حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ یعنی دکھنی اور شمالی۔ تاریخی اعتبار سے اسی کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی متقدمین، متوسطین، متاخرین۔ دور متقدمین میں گجرات و دکن کی قدیم شاعری شمار

کی جا سکتی ہے۔ متوسطین میں ولی اور اُس کے ہمعصروں سے دورِ اوّل کا آغاز ہوتا ہے۔ چونکہ ولی کے دور سے ایک انقلاب رُونما ہوتا ہے۔ سراج، داؤد، عزلت (گجرات و دکن میں) اور بعد کو شاہ مبارک، شاکر و حاتم (شامل ہیں)، متوسطین کا دوسرا دور رہے۔ تیسرا دور میر و مرزا اور چوتھا دور انشاء و مصحفی کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ متاخرین میں دورِ اوّل آتش و ناسخ کا ہے۔ اور مومن و غالب دوسرے دور کے نمائندے ہیں۔ مومن و غالب کے بعد امیر و داغ کا دور آتا ہے۔ اس دور کی خصوصیت کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ یہ دور اگلے تمام ادوار کا ردِعمل ہے۔ اس دور کو جدید شاعری کا پیش خیمہ قرار دیں تو نامناسب نہ ہوگا " اس دور کو قدیم و جدید شاعری کے رات اور دن کے درمیان کا دھندلکا کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس کے بعد آزاد و حالی سے جدید شاعری کا دور شروع ہوتا ہے اور اس شاعری پر بھی کئی دور گزر چکے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام ادوار میں ایک دور کا دوسرے دور سے ایسا تعلق ہے جیسے رات کا دن سے۔ ان کی مختلف خصوصیات بیان کرنا یہاں طوالت سے خالی نہیں تاہم اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ تمام خصوصیات کا سرسری مطالعہ ایک مشترک خصوصیت کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دکھن اور شمالی ہند میں ہر دور کی شاعری میں مصلحین نے ایک بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ کلام میں فارسی کی آمیزش کی جائے اور حتی الامکان ہندی الفاظ اور قدیم محاورے چُن چُن کر نکال دیئے جائیں۔

اسی ذرّہ نوازی کا نتیجہ آخر کار غالب و مومن کے ہاتھوں میں پہنچنے تک یہ ہوا کہ اس ذرّہ کو جو خورشید کی روشنی کی بدولت چمک رہا تھا خود خورشید بنا دیا اور زمین سے اُس کو آسمان پر پہنچا دیا۔ اس قسم کی تبدیلیاں کرنے کے کئی وجوہات تھے۔ اولاً شمالی ہند میں مُغلیہ سلطنت کے قیام کی وجہ سے فارسی کا زیادہ چرچا رہا۔ اِس سرزمین پر فارسی شاعری کا پرچم لہراتا تھا۔ ایرانی تہذیب و تمدن

کا ایسے تو سارے ہندوستان پر اثر پڑا۔ لیکن شمالی ہند پر سب سے زیادہ اثر رہا اور دیرپا رہا۔ جب اردو شاعری شمالی ہند میں پہنچی اس وقت فارسی کے بڑے بڑے شعرا موجود تھے اور انھوں نے اردو کا ہاتھ پکڑا۔ اہلِ ذوق کے دِلوں میں فارسی کی شیرینی اور نزاکت، طرزِ تخئیل اور وسعت اس قدر گھر چکی تھی کہ فارسی زبان اور ادب انھیں بدیسی معلوم نہ ہوتے تھے۔ جب اردو ایسے ماحول میں پہنچی تو اس پر بھی وُہی اثر پڑا۔ اور ان اردو دانوں نے اردو شاعری کو کچھ اس طرح فارسی کے رنگ میں رنگنا شروع کیا کہ کسی طرح اردو زبان فارسی سے کم مایہ اور کم پایہ ثابت نہ ہو۔

الغرض فارسی کا تتبع اس انتہا کو پہنچ گیا کہ اردو اردو نہ رہی اور اردو کے ابتدائی ادوار میں فارسی کی آمیزش سے جو لطافت پیدا ہوئی تھی وہ بعض صورتوں میں عیب بن کر نظروں میں کھٹکنے لگی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بعض حلقوں میں اردو شاعری ہدفِ ملامت بن گئی۔

اردو شاعری کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں لے دے کر غزل ہے۔ اس کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ یہ گل و بلبل، کنگھی چوٹی کی شاعری ہے۔ اس میں رقیبوں کی بہتات ہے۔ شاعروں کے خیالات میں یک رنگی نہیں، کہیں صوفی و زاہد پاک ذات، تو کہیں رند شاہد باز کہیں واعظ خشک تو کہیں خراباتی پاک باز، اردو شاعری میں معشوق مرد ہوتا ہے۔ معشوق کا ظلم و ستم ایک قصاب کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس شاعری میں بدیسی چیزیں ہیں۔ یہ غیر فطری ہے۔ اس میں ہندوستانیت بہت کم پائی جاتی ہے وغیرہ۔ بعض اہل علم حضرات اس قسم کی نکتہ چینی کا معقول جواب دے چکے ہیں۔

اگر اردو ادب کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ جہاں اردو نے فارسی سے خوشہ چینی کی ہے۔ وہاں اردو ہندی ادب اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کی بھی زیر بار احسان ہے۔ پہلے تو اردو کی عمارت کی بنیاد ہی ہندوستانی زبان پر ہے۔ اردو کے سابقوں اور لاحقوں کو

دیکھئے کہ فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ ہندی بھی ہیں۔ مصادر پر غور کیجئے تو جہاں عربی اور فارسی سے گڑھ لئے گئے ہیں وہاں ہندی ترکیب پر بھی بنائے گئے ہیں۔ مفردات کو چھوڑ کر مرکبات کو دیکھئے تو وہ بھی ہندی اور عربی فارسی کے میل سے بنائے گئے ہیں۔ یہ سب اردو میں ایسے کھپائے گئے ہیں کہ ہندی معلوم نہیں ہوتے۔ لیکن انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ تمام توضیح و تشریح کے باوجود بھی ہمیں اس بات کا اقرار کرنا ہوگا کہ ہمارے شعرائے کرام نے اپنے ملک کی روایات، آسمان شکوہ پہاڑ، ملک کی امرت بھری ندیوں، ملک کے پھل پھول اور ملک کے کرشن اور رادھا سے بہت اجنبیت برتی ہے اور یہ کہنے والا کوئی نہ نکلا کہ

وہ ندیاں ہیں امرت کے دھارے

دنیا سے اونچے پربت ہمارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

میر و مرزا سے لے کر آزاد و حالی و نظیر کو چھوڑ کر ہم تک ہمیں خال خال ایسے نمونے ملتے ہیں کہ جہاں ہندیہ وطنیت موجزن ہے۔ اور کہیں تشبیہہ اور استعارے کی صورت میں مقامی اشیاء نظر آتی ہیں لیکن یہ بہت ناکافی ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے واضح ہو چکا ہوگا کہ ہندوستانی عنصر کی کمی شمالی ہند کے نازک مزاج شعرائے کرام کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ تھی۔ گجرات و دکن بھی کسی حد تک اس گناہ کے مرتکب ہیں کیوں کہ یہ پودہ گجرات و دکن ہی میں پہلے بار آور ہوتا ہے۔ اس کی وجہ دانستا ضرور کہنا ہوگا کہ اگر اردو شاعری کا سفینہ گجرات و دکن کے ناخداؤں کے ہاتھوں میں رہتا تو وہ کم از کم اردو شاعری کی بعض پرانی خصوصیات کو قائم رکھ کر اور اس کے دیسی ہونے کی کچھ شہادت دے کر اسے طعن اغیار کی زد سے بچا لیتے۔

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ شمالی ہند کے شعراء کے کلام میں فارسیت کا جو موجیں مارتا سمندر ملتا ہے وہ گجرات و دکن کے ابتدائی ادوار میں محض ایک لہر سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا یعنی یہی خصوصیت خاص اردو کے آغاز سے برابر اس ادب کا طغرائے امتیاز رہی۔ اردو کی ادبی تشکیل کے زمانے سے لے کر ولی کے دور تک یعنی ۹۰۰ھ سے ۱۱۰۰ھ تک اردو ادب کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں پیران طریقت کے ارشادات گرامی بھی ہیں۔ قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار میں بزمیہ، رزمیہ، مثنویاں، غزل، قصیدے، مرثیے وغیرہ ملتے ہیں۔ اور اس تمام کلام کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظم کا طرز تخئیل ہندی ہے۔ الفاظ زیادہ تر مقامی زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ روایات ضرور مذہبی ہیں۔ جو عرب و ایران سے تعلق رکھتی ہیں۔ فارسی الفاظ کو اردو میں باجن، علی جیو گام دھنی اور ان کے بعد آنے والے صوفیہ نے کسی حد تک استعمال کیا ہے۔ بلکہ بوقت ضرورت انھوں نے فارسی محاوروں کا یا تو ترجمہ کر لیا ہے یا انھیں بجنسہٖ کھپا دیا ہے۔ جیسے رقص سے 'رقصے' بنا لیا۔ ہندی اور ان کے ساتھ ساتھ فارسی کی بحروں کو روشناس کرانے والے انھیں میں سے ایک بزرگ خوب محمد چشتی متوفی ۱۰۲۳ھ تھے۔ فارسی صنعتوں کو بھی اسی دور میں اردو کے دربار میں باریابی ملتی ہے۔

۱۱۰۰ھ کے بعد سے ولی کا دور شروع ہوتا ہے۔ غزل کا یہ باوا آدم اردو شاعری میں غزل کو کچھ ایسے انوکھے ڈھنگ سے روشناس کراتا ہے کہ پورے اردو ادب میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ اور اس طرز نو کی شمالی ہند میں ایسی دھوم مچی کہ سخن وران باکمال اور شیدایان نغمۂ شیراز کے دل بھی اس ترقی یافتہ ریختہ نے موہ لئے اور ان سخنوروں نے دو دو چار چار شعر اس طرز نو میں کہہ کر اپنا شوق پورا کیا۔

عالمگیری دور کے ایک امیر مرزا معز الدین فطرت موسوی کا شعر ہے:-

در زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے — در خانۂ آئینہ گھٹا دگھٹا جھوم پڑی ہے

اس دور کے ایک اور شاعر قزلباش خاں امید کا شعر ہے :-

باہن کی بیٹی آج میری آنکھ ہوں پڑی — غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لڑی

مرزا عبدالقادر بیدل سے کون واقف نہیں۔ ان کے شعر ہیں :-

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں — اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا — پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہیں ہم ہیں

مرزا اعلیٰ قلی خاں ندیم بھی عالمگیری دور کے اساتذۂ فارسی میں شمار کئے جاتے تھے۔ کہتے ہیں :-

جدائی میں تری ہم کیا کہیں کس طرح جلتے ہیں — بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں

بیقرار عشق کو ہے زندگی نقص کمال — مر چکی سیماب تب کہتے ہیں یہ اکسیر ہے

سراج الدین علی خاں آرزو جن کے چشمۂ فیض سے کئی نامور شعرا سیراب ہوئے اور جن کی فارسی دانی ایک زمانہ میں مسلم ہے۔ ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

ہر صبح آوتا ہے تیری برابری کو (دن) — کیوں دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو (دن)

مہتلے نے آج جا کر شیشے تمام توڑے — زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

الغرض شمالی ہند میں میر صاحب اس کو معشوق دکن کہہ کر تو ظلم کو اٹھتے ہیں اور سودا اور قائم اس کو پھسپھسی بات سمجھ کر کبھی منہ لگا لیتے ہیں۔ اور اردو نظم کی اس مقبولیت کا سہرا ولی کے سر ہے۔ کیونکہ ولی نے ریختہ کو ایسی اچھی صورت میں پیش کیا کہ وہ سب کو بھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ولی نے شاہ گلشن کے ایما سے اپنا طرز بیان بدلا اور فارسی کے مضامین لے کر اردو میں انہیں داخل کرنا شروع کیا۔ لیکن اس بیان میں صداقت کتنی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ گلشن نے دلی یا برہانپور یا گجرات ہی میں ملاقات کے وقت ولی کی اس طرز جدید [illegible] بیان کی تردید

کے لئے بڑی شہادت یہ ملتی ہے کہ ولی خود اختراع پسند دماغ لے کر آیا تھا۔ اُس کے سامنے گجرات و دکن کے نمونے موجود تھے۔ جن میں فارسی آمیزش کی خصوصیت دورِ اوّلین سے چلی آتی تھی۔ ولی خود ادب کا بڑا نبض شناس تھا۔ وہ ادب کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھا۔ فارسی ادب پر بھی اس کو کافی عبور حاصل تھا۔ اور اس لحاظ سے ولی ایسے آدمی کو رہبروں کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ پیرووں کی ضرورت تھی۔ یہی اختراع پسندی تھی جس نے ولی کو دوسرے شعراء سے ممتاز قرار دیا اور اسی خصوصیت کی وجہ سے آج بھی اردو زبان کے قدردان ولی کو اپنا امام سمجھتے ہیں۔ ولی نے جو خدمت انجام دی وہ خدمت نہ تو معمولی تھی اور نہ کسی معمولی شخص کے بس کی بات تھی۔ یہ خدمت ولی کا سا ذہین، ترقی پسند اور بے شمار قابلیتوں کا مالک نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکا جس کا بڑا ثبوت اس کے کلام کی عام مقبولیت ہے۔

ولی اپنے پیش روؤں کے نقشِ قدم پر چلا اور اس نے اپنی گرہ کا بھی کچھ صرف کیا۔ ولی سے پہلے بھی فارسی ادب سے اردو میں کافی مدد لی گئی لیکن ایک عرصہ تک کچھ ایسی بے جوڑ سی بات رہی کہ قدم قدم پر مصلح کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ آخر ولی نے آکر اس کمی کو پورا کیا اور فارسی ادب سے ایسی پیوندکاریاں کیں اور ایسی موزونیت پیدا کر دی کہ اردو شاعری کو چار چاند لگ گئے۔ دوسری طرف ولی نے ہندوستانی ماحول اور عنصر کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اور ان دونوں میں کچھ ایسا امتزاج پیدا کر دیا کہ یہ سے دو آتشہ ہر صوفی و رند کی مجلس میں بار پانے کے قابل ہو گئی اور نئے اور پرانے میکش سب ہی اس سے سرشار ہونے لگے۔

افسوس کہ ولی نے جس قسم کی تخیل بندی کی تھی اور جس امتزاج سے اردو شاعری کے چمن کو بدیسی پھولوں کے پودوں سے سجایا تھا۔ اس کی آبیاری میں اس کے پیرو ڈرے۔ [illegible] آہستہ آہستہ اپنے خیال، اپنی پسند اور ظاہرا رنگ کو دیکھتے ہوئے دیسی پھولوں کو چن چن کر نکال پھینکا۔

اس قسم کی صفائی کوئی بے معنی نہیں تھی لیکن اس رجحان سے زبان کو یہ صدمہ پہنچا کہ ثقیل اور بھدے محاوروں اور الفاظ کے ساتھ اچھے لفظ اور محاورے بھی ٹکسال باہر قرار دئے گئے اور اچھا خاصا ذخیرہ اردو میں سے کم ہو گیا۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعض اصلاحیں قابل داد ہیں جیسے 'ہمن' کا 'ہم' بنا لیا گیا۔ 'سنگات' سے 'ساتھ'، 'سین' اور 'سیتی' سے 'سے' بنا لیا گیا۔ 'بھواں'، 'پلکاں'، سے 'بھویں'، 'پلکیں' بنا لیا 'کوں' کا 'کو' اور 'سوں' کا 'سے' ہو گیا۔ 'مجھ آنسو' سے 'میرے آنسو'، 'بھر نظر' سے 'نظر بھر'۔ 'ان نے، جن نے، سے 'اس نے، جس نے' یا 'تسبی' کی صحیح املا "تسبیح" اور 'سہی' کو صحیح املا میں 'صحیح' لکھنا شروع کیا۔ یہ مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ ورنہ ایسے بے شمار الفاظ نکلیں گے جو قابل اصلاح تھے اور جو ترک بھی کر دئے گئے لیکن یہ کہاں کا انصاف تھا کہ ہندی الفاظ جو فارسی الفاظ سے کسی طرح لوچ اور شیرینی میں کم نہیں تھے نکال دئے گئے۔ جیسے سجن، سریجن، موہن، پیتم، بچن، سکھ، مکھڑا، نین وغیرہ ایسے بے شمار الفاظ ملیں گے جنھیں متروک کر دیا گیا۔ اسی طرح بدیسی تلمیحات اور استعارات کی بھی اتنی ہی بہتات ہو گئی ورنہ یہی جیحون اور سیحون دور اولین میں اردو ادب میں محض پانی کے سوتے تھے جو آخر میں شاندار امرت کے دھارے بلکہ خود سمندر بن گئے کہ ان سے ڈر معلوم ہونے لگا۔ اسی طرح کوہ الوند اور البرز نے بھی اب ہمیں ڈرا دیا

جہاں تک تلمیحات کا تعلق ہے۔ فارسی کی تلمیحات سے ہمارے ادب میں ضرور اضافہ ہوا۔ اور تلمیحات کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا ہے اتنا ہی ادب کو فائدہ پہنچتا ہے۔ تلمیحات سے بڑے بڑے قصے جن کے بیان کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں وہ جملوں میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔ تلمیحات سے مذہبی عقائد،

رسوم، تاریخی واقعات وغیرہ سے آگاہی ہوتی ہے۔ اگرچہ فارسی سے کچھ تلمیحات لی گئی ہیں۔ ان کی ہمیں ذرا شکایت نہیں لیکن ہم ہندوستان سے بھی اسی قدر فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

جب ہم ولی کا کلام دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مصلح زبان نے ہندوستان کی تاریخی، مذہبی، معاشرتی ہر قسم کی تلمیحات کو اپنے کلام میں کھپایا ہے۔ رستم و اسفندیار کے مقابلہ میں ارجن کو لا کھڑا کیا ہے تو حور و قصور کے ساتھ ساتھ کرشن اور گوپیوں کو بھی جگہ دی ہے۔ مکہ و مدینہ کے ساتھ کاشی اور ہردوار کو بھی نہیں بھولا۔ جوگی، بیراگی اور سنیاسی کو صوفی صافی کی صف میں جگہ دی ہے۔ ایک طرف عید سعید ہے تو دوسری طرف دیوالی کے دیے بھی روشن نظر آتے ہیں، ولی ایک طرف تو فارسی شاعری کے تتبع میں مرہٹہ لڑکے کو اپنا معشوق قرار دیتا ہے تو دوسری جانب ولی کا معشوق اپنی تمام نسوانیت کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ اسی طرح چنگ و رباب کے ساتھ بانسری کے سریلے سر سنائی دیتے ہیں تو کسی جگہ طبلہ کی تھاپ گونجتی ہے اور راگ الاپے جاتے ہیں۔ جیحون و سیحون اور نیل و فرات کا ہمیں کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن گنگ و جمن اور تاپتی اور نربدا کے دھارے بہتے نظر آتے ہیں۔ جہاں زیور، سنگھار اور خورد و نوش کا ذکر کیا ہے وہاں ہندی زیورات اور احمد آبادی حلوے سوہن کو نہیں بھولا ہے۔

الغرض ولی کے کلام میں جو کچھ ہندی عنصر پایا جاتا ہے کوئی غیر ارادی طور پر نہیں روشناس کرایا گیا لیکن صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ولی نے کسی خاص مقصد کے تحت یہ کام کیا ہے۔ اور یہ مقصد فارسی اور ہندی سے ایک امتزاج قائم کرنا تھا جس کی وجہ سے ارادتاً ایسی پیوند کاری کی گئی ہے۔ ولی کے کلام میں لاحقے، سابقے اور مرکبات وغیرہ بھی اسی امتزاج کے غماز ہیں۔

یہاں ولی کے کلام میں سے بطور نمونہ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ ولی نے خصوصاً صنعت ایہام، مناسبت لفظی وغیرہ میں ان ہندی ناموں اور لفظوں سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے اور بڑی سلیقہ مندی سے کھپانے کی کوشش کی ہے :-

جو دھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم — ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

تب کا مشتاق جی ہے چھمن سوں — کشن سوں جبکہ رام رامی ہے

کشن کی گوپیاں کی نہیں ہے یہ نسل — رہیں سب گوپیاں وہ نقل یہ اصل

گرچہ چھمن ترا ہے رام وسے — اے سجن تو کشن کا رام نہیں

رات دن انچھواں میں اپنے شاستر کرتا ہے — اے برہمن دیکھ تجکوں بید خواں مجنوں ہوا

اس کے خط و خال سے پوچھو خبر — بوجھتا ہندو ہے باتاں بید کی

کیا وفادار ہیں کہ ملتے ہیں — دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

لیلاوتی تو خواب میں پائی ہے منتہی — ہر شب تری زلف سوں مطول کی بحث تھی

جگت جوگی ہوا ہے دیکھ تجکوں — سرج جوگی۔ فلک جوگی کی مڑھ ہے

زلف تیری ہے موج جمنا کی — پاس تل اس کے جیوں سناسی ہے

مقامات :-

کوچۂ یار عین کاسی ہے — جوگی دل وہاں کا باسی ہے

اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال — ہندوے ہردوار باسی ہے

کروں کیوں سنگ دل کے دل کو تسخیر — زبردستی میں ہیجا پرو کا گڑھ ہے

ہندی سازوں اور راگ راگنیوں کے نام :-

سوزن سوں تجھ پلک کی اے نور جان و دیدہ — ہر استخواں میں روزن ہے بانسلی کے مانند

ترے غم میں دل سوراخ سوراخ — کیا پیدا صدا ائے بانسلی کوں

ہوا رباب رگاں خشک و استخواں بے مغز — یہ حال دیکھ کے مجلس میں دنگ ہے مردنگ

رہے بدن پہ طنبورے کے تار گنتی کے — غصے سوں اس پہ جو آ مفلسی نے مارا چنگ

دل کو شادی ہے کیوں نہ باجے آج
ہر طرف جگ میں تال اور مندل

پی کوں دیکھا نہیں ہوں اس نوبت
دل میرا اس سبب سوں جھانجھ میں ہے

آدے فلک سوں زہرہ اُتر گروہ مہ جبیں
اک تان، گادے رام کلی یا بھباس میں

ندّیاں :-

تیرے غم سوں تپتی ہے چھاتی مری
ہوئے اشک سوں دو نین نربدا

گنگا روان کیا ہوں اپس کے نین ستی
آ اے صنم شتاب ہے روز نہان آج

زلف تیری ہے موج جمنا کی
پاس تل اس کے جیوں سناسی ہے

زیور اور سنگھار :-

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا

تجھ میں ملنے سوں گر اپنے سہاگن نا کرو گے مجھ
تو چوڑا گجری کا اور کریلا دھار کرنا کیا

(نوٹ :- چوڑا گجری = ہاتھی دانت کی بڑی چوڑیاں)

دونوں بھواں کے میانے ٹیکا نہیں زری کا
ہے قوس کے برج میں جھلکار مشتری کا

مہ جبیں پر لگائے کیوں ٹیکا
ماہ میں کام کیا ہے دیوٹکا

ہنسلی تجھ گل میں دیکھ کہتے ہیں
چاند سیں مکھ کا ہے یہ ہالا

تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل
یہ روشنی افزا ہے انکھین کو لگاتی جا

موتی ادھر رنگین بدل کھا پان مستی لاتے ہیں
لب پر شفق اور شام کوں ایک ٹھار کر دکھلاتے ہیں

پھول :-

محصور کیا ہے جگ کوں سجن تیری گلی نے
دیکھ نا سکے تجھ چشم سوں چنپے کی کلی نے (؟)

نین دیول میں پتلی ہے ویا کعبہ میں ہے اسود
ہرن کا ہے یو نافہ یا کنول بھیتر بھنور بستا

دیوالی:۔

تری زلفاں کے حلقے میں دسے یوں نقش رخ روشن ——— کہ جیسے ہند کے بھیتر اگن دیوے دوالی میں

حلوا:۔

اے شکر لب قند سوں تجھ لب کی باتاں ہیں لذیذ ——— حرف تیرا اس کے ہیں جیسے حلوۂ سوہان لذیذ

پان:۔

کرتا ہوں جاں سپاری، کتھی ہیں ہاتھ جس کے ——— کرنے کوں دل کا چونا آتا ہے پان کھا کر

لاحقے اور مرکبات ملاحظہ فرمایئے:۔

کیا بے ہوش مجھ دل کو انیندی نین ساقی نے ——— عجب رکھتا ہے کیفیت زمانہ نیم خوابی کا

(انیندی = بے خوابی)

ہر جنس کا معما بوجھا گیا ہے اما ——— تجھ راز کا معما اب تک میں رہا ہے انحل

(انحل = لاینحل)

مرکبات:۔

ترکش اپس جبیں سوں نکال اے شکر بچن ——— عشاق پر غضب ہے یہ ناز و ادا نہیں

گریباں صبر کا مت چاک کر اے خاطر مسکیں ——— سنے گا بات وہ شیریں بچن آہستہ آہستہ

مکھ سوں تیرے بچن مبارک سن ——— گل کے کوہر ہوا ہے سراپا آب

ثنا لکھنے ہیں اس آہو نین کی ——— ہوا جیوں شاخ نرگس ہر قلم سبز

اسی طرح ولی نے ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت کثرت سے استعمال کی ہے:۔

جیسے نقش چرن، رنگ پان، روز ہان، نین ساقی وغیرہ

آخر میں دو ایک غزل ملاحظہ فرمایئے جن میں محبوب اپنی تمام نسوانیت کے ساتھ

جلوہ گر ہے:۔

مت غصہ کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف
اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا

مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی پجن ہاری اس بت کو پجاتی جا

تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل
یہ روشنی افزا ہے انکھین کو لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

چلنے سنیں اے چنچل ہاتی کوں لجاوے توں
بیتاب کرے جگ کوں جب ناز سوں آوے توں

یک بارگی ہو ظاہر بے تابی مشتاقاں
جس وقت کہ غمزے سوں چھاتی کوں چھپاوے توں

گویا کہ شفق پیچھے خرشید ہو اظاہر
جب اوٹ میں پردے کی چہرے کوں دکھاوے توں

لولی فلک مکھ تیں انگشت تحیر لے
جب پاؤں نزاکت سوں مجلس میں بجاوے توں

عشاق کی شادی کی اس وقت بجے نوبت
مردنگ کی جس ساعت آواز سناوے توں

یک تان سنانے میں جی جان لیا سب کا
اب دل سوں گزر جاویں گر بھاؤ بتاوے توں

توبائے ریائی سوں شاید کہ کرے توبہ
اس وقت ولی کو گر یک جام پلاوے توں

ان غزلوں میں ولی فارسی شعرا کی تقلید سے آزاد ہو کر ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ولی کے بعد آنے والے شعرا اس تبدیلی کی اہمیت کو کما حقہ نہیں سمجھے۔

کتابیات

کتاب	مولف	مرتب یا مطبع
تذکرۂ ریختہ گویاں	فتح علی حسینی گردیزی	مولوی ڈاکٹر عبدالحق صاحب
گلشنِ گفتار	خواجہ خان حمید اورنگ آبادی	
نکات الشعرا	میر تقی میر	سید محمد ایم۔ اے
تذکرۂ شعرا	میر حسن	ڈاکٹر عبدالحق
مخزن نکات	قیام الدین قائم	
مجموعۂ نغز	میر قدرت اللہ قاسم	حافظ محمود شیرانی
گلشن ہند	مرزا علی لطف	ڈاکٹر عبدالحق
چمنستان شعرا	لچھمی نرائن شفیق	ڈاکٹر عبدالحق
سخن شعرا	عبدالغفور خاں نساخ	مطبوعۂ نول کشور
گلشن بیخار	شیفتہ	
مخزن شعرا	قاضی نورالدین حسین فائق	مولوی ڈاکٹر عبدالحق
حدیقۂ احمدی مخطوطہ جلد ۳	شیخ بہادر	
آثار الشعرا	محمد ممتاز علی خاں	مطبع شاہجہانی بھوپال
محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن (حصہ اول و دوم)	مولوی عبدالجبار خاں	رحمانی حیدرآباد
ماثر الکرام موسوم بہ سروِ آزاد	غلام علی آزاد بلگرامی	مولوی عبدالحق
دفتر اول		مفید عام آگرہ
آبِ حیات	شمس العلماء محمد حسین آزاد	مطبوعۂ ۱۸۸۳ء
شعر الہند حصہ اول	مولوی عبدالسلام ندوی	مطبوعۂ دار المصنفین اعظم گڑھ
گل رعنا	حکیم عبدالحی	" " "
اردوے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	" نول کشور
اردو شہ پارے	ڈاکٹر سید محی الدین قادری	مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد
دکن میں اردو	مولوی نصیر الدین ہاشمی	" " "
اردو مثنوی کا ارتقا	عبدالقادر سروری	
یورپ میں دکنی مخطوطات	مولوی نصیر الدین ہاشمی	شمس المطابع حیدرآباد
اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو دہلی

کتاب	مؤلف	مرتب یا مطبع
مقالات ہاشمی		تاج کمپنی لاہور
کلیاتِ ولی طبع اوّل		حسن مارہروی
کلیاتِ ولی طبع دوم		نورالحسن ہاشمی
کلیاتِ ولی		پروفیسر حیدر ابراہیم سایانی
کلیاتِ ولی		غلام محمد منظور ۱۲۹۰ھ
نذرِ ولی	طالبات جامعہ عثمانیہ	ادارۂ ادبیات حیدرآباد
شعر العجم جلد ۵	مولانا شبلی نعمانی	دارالمصنفین اعظم گڈھ
کٹلاگ آف عربک مینوسکرپٹ	اڈولاتھ	
نورالمعرفت	قاضی سید نورالدین	سید ظہیرالدین مدنی
سخنورانِ گجرات	سید ظہیرالدین مدنی	
نورالعرفان مخطوطہ	شیخ محمد صالح	
رودِ کوثر	شیخ محمد اکرام	لاہور
مراۃ احمدی خاتمہ	علی محمد خاں بادشاہی دیوان	بڑودہ سیریز
مراۃ احمدی حصہ اوّل		″
یادِ ایام	حکیم عبدالحی	
اورنگ زیب جلد ۱-۲-۳-۴	جادو ناتھ سرکار	رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ
ہسٹری آف دی مغل امپائر	ایشوری پرشاد	انڈین پریس۔ الہ آباد
سٹڈیز ان دی ہسٹری آف گجرات	ایم ایس کامیسریٹ	
مقدمۂ رقعاتِ عالمگیری	سید نجیب اشرف ندوی	دارالمصنفین اعظم گڈھ
اردو سہ ماہی جنوری ۱۹۴۷ء		
اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۴۱ء اگست ۱۹۳۴ء نومبر ۱۹۳۰ء		
مصنف ۱۲ء		علی گڈھ
الموسی۔ ولی نمبر ۱۹۳۷ء	سٹی کالج میگزین حیدرآباد	
ہندوستانی جولائی ۱۹۳۲ء		
انسائکلوپیڈیا آف اسلام		
اردوئے معلیٰ		
خطباتِ گارساں دتاسی	گارساں دتاسی	انجمن ترقی اردو

غلط نامہ

غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر
بصر	ببر	۶	۱۳	ستھے	تھی	۱۰۱	۹
اور	×	۱۰	۱۵	دؤلت	دوات	۱۰۱	۱۰
۹۹۰ھ	۹۹۸ھ	۴۱	۴	باؤل	باول	۱۰۲	۱
قائم	قاسم	۵۴	۹	جگہ	چکہ	۱۰۲	۱
چاہئے اس	چاہیئے کہ اس	۶۶	۱۱	جوکٹی	جوکری	۱۰۸	۱۵
می	ے	۶۸	۱۳	جنا عدن	جنّات عدن	۱۱۲	۸
۵۵۱ھ	۶۱۱ھ	۷۰	۱	امرت بچن	×	۱۱۳	۳
صوۃ	صلوٰۃ	۷۱	۳	بے جاپہ	بیجاپر	۱۱۵	۱۶
۱۱۰۹ھ	۱۱۰۳ھ	۷۱	۷	آب لقا	آب بقا	۱۱۸	۱۲
ہو	ہوا ہو	۷۷	۱۱	اشک	رشک	۱۲۸	۱۷
۲ھ	×	۷۸	۷	دونوں	دانوں	۱۳۳	۵
العناد	الفساد	۸۱	۲	(دون)	(دن)	۱۴۶	۱۲
بعض	بڑے	۹۰	۱۱	کرتا ہے	کرتا ہے مگر	۱۵۰	۵
دب کر = دفن کردن	دب کردن = دفن کرنا	۹۲	۱	ہندوسے	ہندوے	۱۵۰	۱۳
مذکورۂ	مذکورہ	۹۸	۱۲	بیجاپرد	بیجاپر	۱۵۰	۱۴
نچھل	نچھل کوئی	۱۰۰	۷	گجری	گجگری	۱۵۱	۱۰
زیب	زیبا	۱۰۰	۱۳	سمجھ	سمجھو	ب	۱۲
میرے	میری	۱۰۱	۹	اس سلسلہ	اس سلسلہ میں	ب	۱۳

ولی گجراتی اردو کے اولین شاعر

کی

مایۂ ناز تصنیف

رسالہ نور المعرفت

مرتبہ

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

قیمت عمر

ملنے کا پتہ

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲- ہارنبی روڈ بمبئی نمبر ۱